رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

Urdu
218

نگار

قیمت فی کاپی ۸ر

UNIVERSITY
-1 JUL

چندہ سالانہ پانچ روپیہ
ششماہی تین روپیہ

نگراں : نیاز فتحپوری

ادارہ :- مجدّد نیازی
شوکت جہاں

جلد ۴۳ | فہرست مضامین جون سنہ ۴۳ء | شمار ۶

ملاحظات ---------- ۲
سید امداد امام اثر اور غالب ---- حبیب احمد صدیقی ام-اے -- ۳
روس کی تمدنی، صنعتی اور علمی ترقیاں ---- مجدّد نیازی ---- ۱۰
میر و نظیر ---------- (پروفیسر) سراج احمد علوی ام-اے -- ۱۶
عین الغزال ---------- شوکت جہاں ---------- ۲۲
مومن کی غیر مطبوعہ غزلیں ---------- ۲۴
فلمی دُنیا کی زندگی ---- شوکت جہاں ---------- ۲۷
وقت سے پہلے اور بعد ---- مجدد نیازی ---------- ۲۹
مطبوعات موصولہ ---------- ۳۱
مولانا عبدالماجد دریابادی سنماہال میں ! ---------- ۳۴

دفتر "نگار" کی جدید مطبوعات کا اشتہار صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ ہو

انسائکلوپیڈیا برٹانکا کا گیارھواں اڈیشن مکمل

نہایت اچھی حالت میں معہ گھومنے والی الماری کے

دوسو روپیہ میں فروخت ہو رہا ہے - منیجر "نگار" سے خط و کتابت کیجئے

جلد ۴۳ | جون ۱۹۴۳ء | شمار ۶

آئندہ مہینے "مرثیہ بعد انیس" کے عنوان سے ایک نہایت اہم مضمون شایع ہوگا اور

ملاحظات

اسی کے ساتھ غالب کی فارسی شاعری پر حضرت نیاز کا ایک نہایت بسیط تحقیقی مقالہ

تیونس کے بعد

آخر کار افریقہ کی مہم سر ہوگئی اور بحر روم کے جنوبی سواحل کا فیصلہ اتحادیوں کے حق میں ہوگیا ہر چند اتحادیوں کی یہ فتح کوئی فیصلہ کن فتح نہیں ہے تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ تیونسیا کی فتح نے جنگ کا نقشہ بالکل بدل دیا ہے اور محوری طاقتوں کو اپنی آیندہ تدابیر جنگ میں بہت کچھ رد و بدل کرنا پڑے گا

افریقہ میں اس کامیابی کی اہمیت کا اندازہ تھوڑا بہت تو ہر شخص کر سکتا ہے، لیکن اس واقعہ پر موسیو اسٹالین نے جس بے اختیارانہ انداز سے اظہار مسرت کیا ہے وہ اس کی غیر معمولی اہمیت کا کافی ثبوت ہے

اسٹالین کا عرصہ سے تقاضہ تھا کہ یوروپ میں دوسرا محاذ جنگ قایم کرنا بہت ضروری ہے اور اتحادیوں کی طرف سے اس مسئلہ میں جتنی تاخیر ہوتی جاتی تھی، اسٹالین کا خاموش احتجاج بھی ناخوشگوار صورت اختیار کرتا جاتا تھا، لیکن اب فضا بالکل صاف ہوگئی ہے اور اسٹالین کو بھی دوسرے محاذ کے قیام کا یقین آگیا ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دوسرا محاذ کب کہاں اور کیونکر قایم ہوگا

اس وقت چرچل، روزولٹ اور امریکی و برطانوی ماہرین جنگ کے درمیان جو کانفرنس ہو رہی ہے، اس میں انھیں تمام باتوں پر غور کیا جا رہا ہے اور اسوقت تک جو خبریں موصول ہوئی ہیں ہر چند اُن پر اعتماد کرکے ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتے تاہم یقینی ہے کہ یہ محاذ فی الحال یوروپ میں قایم ہوگا اور غالباً ایک سے زاید جگہ — روزولٹ کی خواہش یہ تھی کہ یوروپ کے ساتھ ہی ساتھ یا اس سے پہلے بحر الکاہل میں جاپان کے خلاف بھی جارحانہ کارروائی شروع کر دینا چاہئے، لیکن بحث و گفتگو کے بعد وہ شاید اس نتیجہ تک پہونچتے نظر آتے ہیں کہ پہلے ہٹلر و مسولینی کی قوت کو ختم کر دینا ضروری ہے

بہر حال اس چوتھے سال میں جنگ کا جو ورق پلٹا جانے والا ہے وہ پچھلے اوراق سے بالکل مختلف ہوگا اور امید کی جاتی ہے کہ اب جو نقشۂ جنگ قایم ہوگا وہ اس لڑائی کو ختم ہی کرکے رہیگا

جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں، محوری طاقتوں کی پوزیشن اب مدافعانہ ہوتی جا رہی ہے، چنانچہ جرمن افواج جو اپریل ہی میں جارحانہ اقدام شروع کر دیا کرتی تھیں، روسی محاذ پر ابتک ایک انچ آگے نہیں بڑھیں - اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ ہٹلر کے پچھلے دو سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ وہ روس کو کسی طرح زیر نہیں کر سکتا اور دوسرا سبب یہ کہ اگر اس طرف اس نے اپنا سارا زور صرف کر دیا تو پھر یوروپ میں اتحادیوں کا اقدام نہایت آسانی سے کامیاب ہو جائے گا

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۳۹)

سید امداد امام اثر اور غالب

جناب حبیب احمد صاحب صدیقی ام۔ اے نے سید امداد امام اثر کی اس رائے کے خلاف احتجاج کیا ہے جو غالب کی فارسی غزل گوئی کے متعلق انھوں نے اپنی مشہور تصنیف "کاشف الحقایق" میں ظاہر کی ہے۔ امداد امام اثر کا شمار اہل ذوق میں سے تھا، لیکن شاید صرف اُردو شاعری کی حد تک۔

فارسی میں انھیں کوئی خاص درک حاصل نہ تھا اور اسی لئے انھوں نے غالب کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس مقالہ کے اختتام پر میں بھی اپنی تفصیلی رائے اس مسئلہ پر پیش کروں گا۔ (ایڈیٹر)

غالب کی فارسی غزلوں کے متعلق "کاشف الحقائق" کے مصنف نواب سید امداد امام اثر تحریر فرماتے ہیں کہ:

"غالب فارسی کے اچھے غزل سرا نظر نہیں آتے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کو فارسی کی معلومات بہت ہے اور شاعری کا مادہ بھی بہت رکھتے تھے مگر ان کی فارسی کی غزل سرائی، غزل سرائی کا حکم نہیں رکھتی ہے۔ جس غزل کو دیکھئے اس سے ان کی مضمون آفرینی۔ خلاقی سخن۔ بلند پروازی۔ نازک خیالی۔ زور آوری وغیرہ عیاں ہے مگر ان کی تمام فارسی غزلوں میں صرف دس پانچ ہی شعر ہوں گے جو غزلیت کا لطف رکھتے ہوں گے ورنہ دیوان کا دیوان حسن مقبولیت سے خالی نظر پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ استعارات وغیرہ سے بہت کام لیتے ہیں جو سچی غزل گوئی کی شان سے بہت بعید ہے فقیر حضرت کا بہت معتقد ہے یعنی ان کو ایک بڑا شاعر گرامی جانتا ہے مگر افسوس ہے کہ ان کی فارسی کی غزل گوئی کو اپنے دل پر تاثیر پیدا کرتے نہیں پاتا۔ حضرت کی غزلوں کے اشعار بیشتر قصیدہ نما معلوم ہوتے ہیں اور کچھ ایسی خاص ترکیب رکھتے ہیں کہ ان سے وہ حظ دل کو نصیب نہیں ہوتا ہے جو غزل سرائی کا تقاضا ہے۔"

یہی مصنف غالب کی اُردو غزلوں کے بارے میں رقمطراز ہے کہ:

"ان کے ان معائب سے (یعنی استعاروں کی افراط اور اضافتوں کی بھرمار وغیرہ سے) گزر کر اس یکتائے روزگار کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھئے تو پھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی۔ واقعی جو سوز۔ گداز۔ خستگی۔ درد۔ برشتگی۔ نشتریت۔ بلند پروازی۔ نازک خیالی۔ لمعنت۔ متانت۔ جلالت۔ تہذیب۔ شوخی غالب کے کلام میں ہے باستثنائے درد و میر کسی اُستاد کے کلام میں نہیں پائی جاتی ہے۔ نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی پر تاثیری کا کیا کہنا۔ دل بے اختیار چلا اُٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں۔ شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہوئی جاتی ہو عالی مذاقی روح کو عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ واردات قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معاملات کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہو اور مختصر یہ کہ حضرت کے کمالات گوناں گوں کا وہی قائل ہو گا جسے قلبی نعمتوں سے فطرت نے محروم رکھا ہے۔"

ان دونوں بیانوں کو پڑھکر حیرت ہوتی ہے کہ وہ شاعر جس کی اُردو غزلیں "سوز۔ گداز۔ خستگی۔ درد۔ برشتگی۔ نشتریت۔ بلند پروازی

نازک خیالی - مکنت - متانت - جلالت - تہذیب اور شوخی" سے مالا مال ہوں اور جس کے کلام کی "پر تاثیری" کا یہ عالم ہو کہ دل بے اختیار ہو جائے اور جو واردات قلبیہ کی ایسی سچی ترجمانی کر سکے کہ نظروں کے سامنے تصویر پھرنے لگے - جب بزبان فارسی غزل سرائی کرنے پر آئے تو غزل سرائی کی تمام اہلیت کھو بیٹھے اور اس کے پچاس پچپن سال کی کمائی میں پچاس پچپن اشعار بھی قابل توجہ نہ ملیں۔

اگر نواب صاحب موصوف نے یہ نہ فرمادیا ہوتا کہ غالب کو فارسی کی معلومات بہت تھی تو یہ نتیجہ بہ آسانی نکالا جا سکتا تھا کہ فارسی زبان پر قدرت نہ ہونے کے باعث اپنے خیالات و جذبات کو اس زبان میں ادا کرنے سے وہ قاصر رہتے تھے مگر جب ہم غالب کے حالات زندگی میں یہ پڑھتے ہیں کہ وہ فارسی زبان ہی تھی جس پر مرزا کو دعویٰ تھا اور جس کے متعلق "قاطع برہان" میں انھوں نے لکھا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا تورآن سے آیا تھا اور میرا باپ دلی میں پیدا ہوا اور میں آگرہ میں۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہلِ زبان سمجھتا ہوں میں بلاشبہ زباندان ہوں اور میری زباندانی اولاً خداداد سلامتی طبع کی بدولت ہے جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اس وجہ سے ہے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرتاً مناسب واقع ہوئی ہے" ان کی فارسی پر فاضلانہ قدرت رکھنے کا ثبوت اُس واقعہ سے پورا پورا ملتا ہے جو حالی نے "قاطع برہان" لکھنے کے سلسلے میں "یادگار غالب" میں بیان کیا ہے۔ حالی کہتے ہیں کہ "جسوقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اسوقت ان کے پاس ایک قلمی برہان کے سوا نہ کوئی فرہنگ تھی اور نہ کوئی دوسرا ایسا سامان جس پر تحقیق لغت کی بنیاد رکھی جاتی پس جو کچھ انھوں نے لکھا یا محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر یا ذوق و وجدان کی شہادت سے لکھا با اینہمہ چند مقامات کے سوا ..... ان کے تمام ایراد واجبی معلوم ہوتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ جو شخص فارسی زبان کی ڈکشنری کی صحت کرنے کا بیڑا اُٹھائے اور صرف اپنی یادداشت اور ذوق و وجدان پر بھروسہ کر کے ایک دو نہیں سیکڑوں غلطیاں لغت کی نکالے وہ اس زبان کا کس قدر بڑا ماہر ہوگا۔ لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غالب کا ذوق غزل سرائی جو ان کی اُردو غزلوں میں بدرجہ اتم نمایاں ہے فارسی کی غزلوں میں اس لئے مفقود ہے کہ فارسی کے زباندان نہ تھے۔

پھر جب ہم مرزا غالب کے متعلق یہ پڑھتے ہیں کہ ان کی وہ شاعری جس کو وہ دراصل شاعری سمجھتے تھے اور جس پر وہ اپنی پوری ذہنی قوت صرف کرتے تھے اُردو کی شاعری نہ تھی بلکہ فارسی کی شاعری تھی تو سید امداد امام کی رائے اور بھی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بڑے شاعر کا وہ کلام جس پر وہ اپنی تمام قوتیں صرف کرے لطف و "نشتریت" سے مبرا رہے اور وہ کلام جو کم توجہ اور نسبتاً لاپروائی سے کہا جائے شاعرانہ لطافتوں سے لبریز ہو۔ بلکہ بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن سد ہاردی کے الہامی کلام ٹھہرے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سید امداد امام نے غالب کی فارسی غزلوں پر یا تو بغیر سمجھے رائے زنی کر دی یا خواجہ حافظ شیرازی کے رنگ سے جن کو وہ غزل کا خدا کہتے ہیں ایسے متاثر تھے کہ دوسرے رنگ ان کو نہایت بے کیف اور پھیکے معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے نظیری نیشاپوری تک کو جس کے بارے میں صائب کا قول ہے۔

صائب چہ مجال ست شوی ہمچو نظیری عرفی بہ نظیری نرسانید سخن را

لائق انتخاب نہیں سمجھا اور "کاشف الحقائق" میں جہاں بہت سے فارسی غزل گو شعرا کے اشعار درج کئے نظیری کا ایک شعر بھی درج نہیں کیا۔ غزلوں کے انتخاب میں نظیری کی غزلوں کو نظر انداز کر دینا ایسا ہی حیرت خیز امر ہے جیسا کہ

غالب کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی غزلوں میں دس پانچ شعر سے زیادہ نہ نکلیں گے۔

غالب کی غزل پر بحث کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی صنف پر نظر ڈالی جائے کہ اس کے لوازم کیا ہیں اور پھر بتایا جائے کہ غالب نے اُن کو کہاں تک پورا کیا ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ غزل کے لغوی معنی "محبوب سے بات کرنے کے ہیں" اور اولاً یہ صنف ایسی ہی دلآویز باتیں کرنے کے لئے ایجاد ہوئی ہوگی۔ مگر ہوتے ہوتے اس میں ہر قسم کے خیالات ادا ہونے لگے۔ صاحب "کاشف الحقائق" اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ "غزل سے وہ صنف شاعری مراد ہے۔ جس میں ایسے مضامین جو اعلیٰ درجہ کے واردات قلبیہ اور ارفع درجہ کے امور ذہنیہ سے خبر دیتے ہیں حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں۔ یہ صنفِ شاعری تمامتر داخلی پہلو رکھتی ہے" انھوں نے اس صنف کے لئے بیس شرطیں لازم قرار دی ہیں اور وہ بیس کی بیس ان کے نزدیک خواجہ حافظ کے ہر شعر میں پوری پوری پائی جاتی ہیں۔ اسی لئے حافظ کی نسبت وہ تحریر کرتے ہیں کہ حافظ کا جواب نہ فارسی شعرا میں ملتا ہے نہ اُردو شعرا میں بلکہ ان سے کسی فارسی یا اُردو شعراء کو نسبت تک نہیں۔ ان کی لگائی ہوئی بیس شرطوں میں سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر داخلی پہلو رکھتا ہو اور اُمور خارجی غزل میں قلمبند نہ ہوں بالخصوص تشبیہات اور استعارات غزل میں حتی الامکان جگہ نہ پائیں کیونکہ وہ بقول نواب صاحب موصوف "عجز طبیعت" ظاہر کرتے ہیں۔

غزل کی یہ تعریف غزل کے امکانات کو بہت تنگ کر دیتی ہے۔ اس تعریف سے خود حافظ کے سیکڑوں عمدہ اشعار جن میں نہایت لطیف تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے گئے ہیں غزل کے احاطہ سے نکل جاتے ہیں۔ حافظ کا ایک بہت مشہور شعر ہے:

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را که سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

اس کے دونوں مصرعوں میں نہایت لطیف استعارات ہیں۔ معشوق کی غزالِ رعنا اور اس کی جستجو کو کوہ و بیابان میں پھرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر استعاروں کا استعمال غزلیت کا منافی ہے تو یہ شعر غزل کا ایک نہایت ناقص شعر ٹھہریگا حافظ کے چند اور لطیف شعر جن میں بلیغ استعارات سے کام لیا گیا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

ماہ و خورشید نمائش زپسِ پردہ زلف آفتابے ست کہ در پیش سحابے دارد

بالا بلند عشوہ گرِ سروِ نازمن کوتاہ کرد قصہ زہدِ درازِ من

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردۂ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

ہر کس کہ بدید چشم او گفت کو محتسبے کہ مست گیرد

ان تمام اشعار میں تشبیہیں اور استعارے اتنے صاف ہیں کہ ان کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی واقعہ یہ ہے کہ اگر تشبیہوں اور استعاروں کو غزل سے نکالدیا جائے تو غزل بدمزہ ہو جائے گی۔ سید امداد امام کو غالب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ ان کی غزل میں استعارات کی بھرمار ہوتی ہے۔ حالانکہ جس کو وہ عیب گردانتے ہیں وہی شاعری کا حرۂ امتیاز ہے۔ تشبیہیں اور استعارے صنائع لفظی کی طرح مطلب و تاثیر کو خاک میں ملا دینے والی

چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان سے دو ناکیف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک معمولی سا خیال برمحل استعارے سے دمکنے لگتا ہے۔ کونسا شاعر ہے جس نے آنکھ کو شراب یا نرگس سے، بالوں کو سنبل یا کالی گھٹا یا سانپ سے، دہن کو غنچے سے، ہونٹوں کو گلاب کو پنکھڑیوں سے، گالوں کو گلاب کے پھول سے، چہرہ کو ماہتاب یا آفتاب سے، نگاہ کو تیر یا بجلی سے، قد کو سرو سے، بات کرنے کو بلبل کے چہکنے سے، ہنسنے کو پھول جھڑنے سے۔ آنسو کو موتی سے تعبیر نہ کیا ہو۔ یہ سب تشبیہیں اور استعارے نہیں تو اور کیا ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں نادر سے نادر تشبیہیں شعرا کے کلام میں ملتی ہیں جن کے استعمال کو اگر غزل میں ممنوع کر دیا جائے تو غزل، غزل نہ رہے اور وہ شعرا جو حافظ کی طرح تمام عمر غزل سرائی میں صرف کر دیتے ہیں کائنات کی خارجی اشیاء کے مطالعہ اور ان کے اظہار سے بالکل محروم رہجائیں۔ اس لئے یہ شرط کہ غزل میں خارجی اشیاء کے بیانات نہ آئیں اور تشبیہ اور استعارے سے حتی الوسع کام نہ لیا جائے نہ آج تک کسی شاعر سے نبھی ہے اور نہ نبھے گی اور اگر کوئی کوشش کر کے نبھائے بھی تو اس کا کلام اس قابل نہ رہ جائے گا کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں اور شوق سے پڑھیں۔

غزل کے متعلق حالی کا نظریہ سید امداد امام کے مقابلہ میں کہیں زیادہ صحیح ہے سید امداد امام کہتے ہیں کہ عشقیہ مضامین اور قلبی واردات کے علاوہ اگر اور کچھ بیان کرنا ہے تو اس کے لئے قصیدہ۔ مثنوی۔ قطعہ وغیرہ کی صنف کو ڈھونڈھنا چاہیئے۔ مگر حالی کہتے ہیں کہ "چونکہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بیکار بھی نہیں رہ سکتی اس لئے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقتٍ شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں یا تازہ کیفیات جن سے اس کا دل روزمرہ کسی واقعہ کو سنکر یا کسی حالت کو دیکھ کر سچ مچ متکیف ہوتا ہے۔ ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔" اسی اصول پر تمام اساتذہ کاربند ہوتے چلے آئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غزل میں ہر موضوع پر اشعار ملتے ہیں۔ اگر غالب ہی نے عشقیہ مضامین کے علاوہ فلسفیانہ اور جنونیانہ مضامین غزل میں داخل کرنے کا سب سے پہلا قصور کیا ہوتا تو بھی خیر لایق تعزیر سمجھے جاتے۔ مگر یہ بدعت تو صدیوں سے چلی آرہی ہے اور خود حافظ نے بھی غزل میں ہر مضمون کے اشعار داخل کئے ہیں۔ صرف عورتوں سے باتیں کرنے ہی تک اپنی غزل سرائی کو محدود نہیں کیا ہے۔

سید امداد امام نے غالب کی غزل "سپاس کیست" "لباس کیست" اپنے انتخاب میں درج کی ہے اور کہتے ہیں کہ "غزل کی غزل پڑھ جایئے کسی شعر یا مصرعہ میں اتنی قوت نہیں کہ تڑپا دے" حیرت ہے کہ ان کو ایک مصرعہ بھی نہ ملا جسمیں غزلیت پائی جائے۔ میں صرف مطلع اور ایک شعر پیش کرتا ہوں اور جوہر شناس طبیعتوں پر فیصلہ چھوڑتا ہوں۔

لعل تو خستۂ اثرِ التماس کیست — بختِ من از تو شکوہ گزارِ سپاس کیست
لطفت بشکوہ از ہوسِ بیشمارِ من، — شوقم بہ نالہ از ستمِ بے قیاس کیست

اس کے بعد انھوں نے حافظ اور غالب کی ہم زمین غزلوں کا موازنہ کیا ہے[1] اور اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ حافظ کے اشعار کہاں اور غالب کے اشعار کہاں۔ دونوں میں مقابلہ کرنا ہی فضول ہے۔ آیئے دیکھیں کیا غالب کے اشعار ایسے ہی قابل

---

[1] حافظ و غالب کا موازنہ کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ ان دونوں میں بھی کئی صدی کا فرق پایا جاتا ہے۔
(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷ پر ملاحظہ ہو)

شرم ہیں جیسا کہ نواب اثر سمجھتے ہیں :-

حافظ	غالب
غلام نرگس مست تو تاجدار انند،	بتانِ شہر ستم پیشہ شہر یار انند
خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند	کہ در ستم روشِ آموزِ روزگار انند
ترا حیا و مرا آبِ دیدہ شد غماز	برند دل بہ ادائے کہ کس گماں نبرد
وگرنہ عاشق و معشوق راز دار انند	فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دار انند
نصیبِ ماست بہشت ایخدا شناس برو	بجنگ تا چہ بود خوئے دلبراں کیں قوم
کہ مستحق کرامت گناہ گار انند	در آشتی نمک زخم دلفگار انند
بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن	تو سرمہ بیں دو ورق در نورد دوم در کش
مرو بصومعہ کانجا سیاہ کار انند	مبیں کہ سحر نگاہاں سیاہ کار انند

مطلع کے پہلے مصرعہ میں حافظ نے نرگسِ مست کے غلام کو جو تاجدار کہا ہے اس کی نہ کوئی وجہ ظاہر کی ہے نہ ثبوت دیا ہے کہ ان کے معشوق کی نرگسِ مست کے غلام کو تاجداری کیوں ملجاتی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں شراب کی رعایت سے ہوشیار باندھا ہے جو ایک معمولی قسم کی رعایت لفظی ہے۔ اس کے مقابلہ میں غالب اس ستم ظریفی کو کہ خود ستم پیشہ ہی شہر یار بنے ہوئے ہیں ایک خاص شوخی کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور دوسرے مصرعہ میں یہ کہنا کہ ان کا ستم تو یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ زمانہ خود ان کو اُستاد بنائے بیان کی لطافت کو دوبالا کر دیتا ہے۔

غالب کا دوسرا شعر اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو نہایت ہی بلند ہے پردہ نشینوں کا دل کو اس طرح اُڑا لینا کہ کوئی گمان تک نہ کرے ایک ایسی بات ہے جو تمام تر اصلیت پر مبنی ہے مگر پھر بھی لوگ آگاہ نہیں ہوتے کیونکہ پردہ نشینوں پر کس کو اس قسم کا گمان ہو سکتا ہے "فغاں ز پردہ نشیناں" کا ٹکڑا نہایت لطیف ہے۔ حافظ کا شعر بھی بہت خوب ہے۔ مگر اسی بات کو حالی نے اس سے بہتر پیرایہ میں ادا کیا ہے :

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط — اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶) — حافظ اپنے رندانہ جوش و ولولہ کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں لیکن اگر یہ سب کچھ تصوف ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے تو مزخرفات کے سوا کچھ نہیں اور اگر حافظ کو واقعی بادہ نوش شاعر سمجھا جائے اور اس کے خمریات کو اس کے صحیح تاثرات، تو غالب اس باب میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حافظ کے یہاں رندی کا مفہوم زیادہ تر خرابات کی بدمستی ہے اور غالب کی بادہ نوشی "روشنگر روان من ست" کے تحت میں آتی ہے۔ حافظ کے یہاں خمریات کے علاوہ بہت کچھ ہے، لیکن اسکا ذکر شاید اس لئے نہیں کیا جاتا کہ اس کے خمریات ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے، اور غالب کے یہاں سب کچھ کے علاوہ خمریات بھی ہے لیکن حافظ سے موازنہ کرتے وقت اسکے خمریات ہی کو سامنے رکھا جاتا ہے، کیا یہ در پردہ اس امر کا اعتراف نہیں کہ زیادہ وسیع مفہوم میں حافظ کا تغزل زیادہ اہمیت نہیں رکھتا — یہ درست ہے کہ حافظ کے یہاں بعض ایسے اشعار بھی ہیں جنکا جواب غالب کیا کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ لیکن یہ بات ایسی نہیں جس پر فیصلہ کا انحصار ہو، کیونکہ غالب بلکہ غالب سے نیچے درجہ کے شاعر بعض اشعار ایسے کہہ گئے ہیں کہ انکا جواب حافظ کے یہاں بھی نہیں ملسکتا۔ مضمون کے اخیر میں یا کسی علحدہ مقالہ کی صورت میں ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ غالب کی فارسی تغزل میں نقشہائے رنگا رنگ کا کیا عالم ہے۔

(ادارہ)

تیسرے شعر میں حافظ نے گناہ کو پارسائی پر ترجیح دینے کی وجہ ظاہر نہیں کی۔ غالب اپنے ایک شعر میں جام جم پر جام سفال کو بہتر ٹھہرانے کے لئے ایک وجہ پیش کرتا ہے :-

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

غالب کے تیسرے شعر کا قافیہ اور مضمون دونوں حافظ کے شعر سے نہیں ملتے اس لئے موازنہ کرنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔

چوتھے شعر میں حافظ کہتے ہیں کہ شراب خانہ میں خوب پیکر چہرہ سُرخ کرلے صومعہ میں جانے سے کیا حاصل وہاں سیاہ کاروں کا دور دورہ ہے۔ یہ شراب خواری کو زہد و تقویٰ پر ترجیح دینے کا نہایت معمولی و بیش پا اُفتادہ مضمون ہے۔

ان چند شعروں کے موازنہ سے ہر صاحب ذوق خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ واقعی غالب کے اشعار اتنے بودے نہیں ہیں جن کو حافظ کے اشعار کے سامنے رکھنا حافظ کی توہین ہو۔

اس کے بعد سید امداد امام نے سعدی اور غالب کی غزلوں کا موازنہ کیا ہے[1] مگر وہ موازنہ کیا ہے بقول مرزا غالب کے "بیک کف بردنِ صد دل" ہے۔ قلم کے ایک ہی وار میں فیصلہ کرکے رکھدیا ہے نہ یہ بتایا کہ سعدی کا کونسا شعر غالب کے کس شعر سے بہتر ہے اور نہ یہ کہ کیوں بلکہ اس کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ سوائے ایک شعر کے غالب کے باقی اشعار اس قابل نہیں کہ سعدی کے اشعار کے ساتھ پڑھے جائیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

غالب کی اُردو شاعری پر (جو قریب قریب سب غزل گوئی پر محمول ہے) متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور انکی تمام خصوصیات سے لوگ روشناس ہوچکے ہیں۔ حالی نے جن خصوصیات کی طرف صرف اشارہ کرکے چھوڑ دیا تھا ان کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن سیوہاروی تفصیل کے ساتھ "محاسن کلام غالب" میں بیان کرچکے ہیں۔ وہ جملہ خصوصیات جن کو سید امداد امام نے سوز۔ گداز۔ خستگی۔

---

[1] سعدی اور غالب کا موازنہ کرنا ہی غلطی ہے۔ امداد امام صاحب کو سمجھنا چاہئے تھا کہ موازنہ ہمیشہ ایک ہی وقت کے یا قریب قریب زمانہ کے شاعروں میں کیا جاتا ہے نہ کہ ان شاعروں میں جن کے درمیان صدیوں کا بعد پایا جائے۔ سعدی تیرھویں صدی کا شاعر تھا اور غالب اُنیسویں صدی کا، اس لئے دونوں کے خیالات و اظہار بیان میں مماثلت کی کوئی صورت ہو ہی نہ سکتی تھی اور ان دونوں کا موازنہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ولی دکنی کا موازنہ عزیز لکھنوی سے کیا جائے۔ سعدی اس میں شک نہیں غزل کا بادشاہ تھا اور اُس کے تغزل میں ترقی کی جتنی گنجایش تھی وہ خسرو نے پوری کردی لیکن سعدی کا تغزل اس چشمہ کی طرح تھا جو نرم و سبک رفتار سے ہموار جگہ پر ہلکے ہلکے ترنم کے ساتھ بہ رہا ہو پھر جس طرح ہر چشمہ کو دریا بننے سے پہلے بہت سے نشیب و فراز، بہت سی وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے اور جس طرح اور بہت سے چشمے ملکر اسکی وسعت و عمق کو بڑھا دیتے ہیں، اسی طرح امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ سعدی کے رنگ تغزل میں بھی تغیر پیدا ہونا چاہئے تھا اور ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ امداد امام نے پانچ چھ سو سال کے بُعد کو کیوں نظر انداز کردیا۔ وہ شاید سمجھتے تھے کہ سعدی کے تغزل کے بعد زمانہ و شاعری دونوں اپنی جگہ ٹھہر گئے تھے اور تاریخ کو اب کوئی نیا ورق اُلٹنا نہ تھا — سعدی کے تغزل سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، لیکن اگر سعدی کے رنگ سے جدا باقی اور تمام رنگوں کو تغزل کے منافی قرار دیا جائے، تو پھر حافظ کو (جن کے امداد امام بہت معترف ہیں) غالب سے بھی نیچے جگہ دینی پڑے گی، کیونکہ غالب کے یہاں اگر سعدی کی سی سادگی نہیں تو بیان کی وہ شوخی اور اسلوب ادا کا وہ تنوع تو ضرور ہے جو (قطع نظر از تغزل) کم از کم لٹریچر کے لحاظ سے یاد رہ جانے والی چیز ہے، لیکن حافظ تو اس سے بھی محروم ہے۔ (اڈیٹر)

میر کی پوری شاعری صرف اس ایک خیال کی ترجمان تھی کہ زندگی نام ہے انسان اور اس کے ماحول کی جنگ مسلسل کا جس میں انسان کی پسپائی ہر ہر قدم پر لازم و ضروری ہے۔

نظیر بھی میدان محبت میں میر سے کسی طرح پیچھے نہ رہے لیکن نظیر میں اپنے مخالف ماحول سے متصادم ہونے کی اہلیت و قوت موجود تھی۔ نظیر بھی ایک زخم خوردہ اور دل ریش شخص تھا۔ لیکن اس نے میر کی طرح شکست تسلیم کرنا پسند نہ کی اس نے اپنے ماحول کو اپنی شکست پر متبسم ہونے کا موقعہ نہیں دیا۔ بلکہ انتقاماً متضاد ماحول سے ایسا کھیلتا رہا اور اتنی کامیابی کے ساتھ کھیلا کہ کسی کو یہ پتہ نہ چلا کہ نظیر کا راگ ہے کیا بلا، اور کن جذبات کا آئینہ دار ہے۔ نظیر اور میر دونوں زخم خوردہ تھے اور دونوں کی شاعری ان کی آپ بیتی تھی، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ میر نے آپ بیتی کو اس طرح پیش کیا کہ ہر شخص کو اس آئینہ میں اپنے جذبات کے خد و خال نظر آنے لگتے ہیں اور نظیر نے آپ بیتی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا دامنِ حیات زخموں سے داغدار نظر نہیں آتا۔ اس کی آپ بیتی گویا جگ بیتی ہے۔ اس کی خود داری اور نفسی عزت کا احساس اس قدر تیز ہے کہ وہ نہ تو رزم زندگی میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہے اور نہ اپنے قویٰ کی کمزوری کا احساس پیدا ہونے دیتا ہے اور اس کمال میں اس نے وہ انفرادیت پیدا کرلی ہے جو مشرق کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اگر کسی کو یہ طرز ادا اور "فن تلمیس" (Art of camouflaging) کم یا زیادہ حاصل ہوا تو صرف شیخ شیرازی کو جس نے آج تک یاران طریقت کے لئے یہ امر حل کرنے کے لئے رکھ چھوڑا ہے کہ گلستاں یا بوستاں کی داستانیں یعنی آپ بیتی ہیں یا جگ بیتی۔

میر اور نظیر دونوں نے انسانی زندگی اور ماحول کے تصادم کا نقشہ پیش کیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ایک میں انسانی اپنی صورت دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے اور دوسرے میں صورت دیکھ کر رونے لگتا ہے۔ دونوں کی شاعری خواہ کسی صنف کی ہو ان کی ذہنی میلانات کو نمایاں کرتی ہے۔ دونوں نے اصناف شاعری میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے غزل، قطعات، مخمس اور مثنوی کو پسند کیا ہے لیکن میر نے مثنوی اور غزل پر خاص طور سے توجہ کی اور نظیر نے مخمس اور مسدس کو زیادہ اختیار کیا ہے۔

میر اور نظیر کی غزلیں پڑھنے کے بعد جو بات سب سے پہلے ہم کو دونوں میں الگ الگ نظر آتی ہے وہ غزل کو دو زاویوں سے پیش کرتا ہے۔ میر کی غزل پڑھ کر ہمیں فوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ میر کی غزلوں پر غزل کی یہ تعریف صادق آتی ہے کہ غزل جذبات لطیف کی حامل ہوتی ہے، اور نظیر، غزل کو اس کے لغوی معنوں میں استعمال کرتے ہیں، یعنی "گفتگو با زنان" اور اسی وجہ سے اگر ہم یہ کوشش کریں کہ میر و نظیر کی غزل کے اشعار ایک ہی مضامین کے پیش کریں تو مشکل سے کامیابی ہوگی۔ نظیر کے یہاں غزلیں بہت کم ہیں اور ان میں بیشتر غزلیں مسلسل ہیں جن میں نظموں کا محاکاتی رنگ جھلکتا ہے مثلاً ایک غزل میں بسنت کی آمد اور معشوق کی آرائش کو غزل کی آمد اور معشوق کی آرائش کو غزل کی صورت میں یوں پیش کرتے ہیں:-

ملکر صنم سے اپنے ہنگام دلکشائی — ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جان بسنت آئی
سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہوکر — پوشاک زرفشانی اپنی وہیں رنگائی
جب رنگ کے آئی اس کی پوشاک پرتزاکت — سرسوں کی شاخِ پُرگل پھر جا بجا منگائی
اک ٹہنی اُٹھا کر نازک سی اُنگلیوں میں — رنگت کو اس کے اپنی پوشاک سے ملائی
جسدم کیا مقابل کسوت سے اپنے اس کو — دیکھا تو اس کی رنگت اس پر ہوئی سوائی

پھر تو بصد مسرت اور سو نزاکتوں سے
نازک بدن پر اپنے پوشاک وہ کھپائی

چنپے کا عطر ملکر موقع سے پھر خوشی ہو
سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی

بن ٹھن کے اس طرح سے پھر راہ لی چمن کی
دیکھی بہار گلشن بہر طرب فزائی

پھر صحن میں چمن کے آیا بہ حسن و خوبی
اور ترفہ تر بسنتی ایک انجمن بنائی

اس انجمن میں بیٹھا جب ناز و تمکنت سے
گلدستے اس کے آگے ہنس ہنس بسنت لائی

میر نے بھی غزلیں مسلسل لکھی ہیں لیکن اس رنگ کی :-

کچھ کچھ کہوں گا روز یہ کہتا تھا دل میں ہیں
آشفتہ طبع میر کو پایا اگر کہیں

سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو
جاتا تھا اضطراب زدہ سا مگر کہیں

لگ چل کے میں برنگ صبا اس سے یہ کہا
اے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں

آشفتہ جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں
جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھ کو مگر کہیں

موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف
یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں

تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل ہے مر کہیں

کہنے لگا وہ ہو کے برآشفتہ یک بیک
مسکن کرے ہے دہر میں مجھ سا بشر کہیں

آوارہ گاں کو ننگ ہے سننا نصیحتیں
مت کہیو ایسی بات تو بار دگر کہیں،

اب دونوں کے چند ہم مضمون اشعار ملاحظہ ہوں۔ میر صاحب ایک موقعہ پر رونے کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:

اُمڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں،
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں،

نظیر اسی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں :-

اب ترے رونے کا عالم حد سے گزرا ہے نظیر
اشک نے تیرے تو سب جل تھل نکل کر بھر دئے

جہاں تک وفور گریہ کا تعلق ہے نظیر نے طوفانِ نوح کا منظر پیش کیا ہے لیکن میر کے شعر کے مصرع ثانی کی برجستگی نے اسے زیادہ وزنی بنا دیا ہے، اگرچہ طغیانی کم ہے۔

میر صاحب عشق کی سوزش اور اس کے اثرات اس طرح پیش کرتے ہیں:

اُمڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

اسی مضمون کو نظیر نے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے اور خوب ادا کیا ہے :-

کلیجے میں پھپھولے، دل میں داغ اور گل ہیں ہاتھوں پر
کھلے ہیں دیکھئے ہم میں بھی یہ اُلفت کے گل بوٹے

نظیر کا کھنچا ہوا مرقع کتنا جامع اور دیدہ زیب ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ کس طرح شاعر اس گلدستہ سے کھیل رہا ہے، نظیر کی جس خصوصیت کا سطور بالا میں اظہار کیا گیا یہ شعر اس کی ایک بین مثال ہے۔

ایک دوسرے موقع پر محبوب کا سراپا کھینچا گیا ہے اور دونوں اُستادوں نے پورا فن ادا کر دیا ہے۔

میر صاحب فرماتے ہیں :-

تری شام خط کے قریب کے جو صفا میں دیکھی ہیں خوبیاں، نہ سماں یہ گل میں نظر پڑے نہ برنگ صبح بہار میں
جھکی کچھ کہ جی میں چبھی سبھی رہی ٹک کہ دل میں کبھی سبھی یہ جو لاگ پلکوں میں اس کی ہے نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

باغ کی سیر بھی عاشقوں کا خاص مشغلہ ہے۔ کوئی پھول دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری" لیکن کسی کے لئے وہی پھول دل میں چنگاریاں لگا دیتے ہیں، نظیر صاحب فرماتے ہیں :-

گیا میں جو اس بن چمن میں تو سہر گل مجھے اس گھڑی اخگر پیرہن تھا

لیکن میر اس خندۂ بیجا کو برداشت ہی نہیں کر سکتے اور یہ کہتے ہوئے سیر گل سے اغراض کرتے ہیں :

گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اس بن جی جو اُچٹا تو کسی طرح لگایا نہ گیا

عشق کی گیرائی کا خیال شعرا کے یہاں عام طور سے پایا جاتا ہے۔ نظیر نے اس خیال کو دو شعروں میں اس طرح ادا کیا ہے
یہ کہتے ہیں کہ عاشق چھوٹ جاتا ہے اذیت سے جب اس کی عمر کو لشکر اجل کا آن کر لوٹے،
ہماری روح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں نظیر اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

تیسرے مصرع کی پستی نے بقیہ مصرعوں کو بھی ہلکا کر دیا اگرچہ چوتھا مصرع سادگی میں بے مثل ہے میر نے یہ پہلو بایا ہے اور کیا خوب کہا ہے :-

اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہو کر اُڑا کریں گے

تعجب ہے کہ نظیر نے میدان غزل میں اس قدر کامیاب ہونے کے باوجود، غزل کو زیادہ پسند نہیں کیا یا پھر جیسا کہ صاحب روح نظیر کا خیال ہے ان کا کلام جو تلف ہو گیا اس میں غزلوں کا سرمایہ زیادہ ہوگا۔ بہر کیف اگر یہ سچ ہے کہ شاعر صرف ایک شعر کہکر زندہ جاوید شعرا کی صف میں داخل ہو سکتا ہے تو ذیل کی غزل یقیناً نظیر کی حیات جاودانی کے لئے کافی ہو:-

کہتے ہیں یاں کہ مجھ سا کوئی مہ جبیں نہیں، پیارے جو ہم سے پوچھو تو یاں کیا، کہیں نہیں
تجھ سا تو کوئی حسن میں یاں نازنیں نہیں، یوں نازنیں بہت ہیں پہ ناز آفریں نہیں
اتنا تو چھیڑتا ہوں کہ کہتا ہے جب وہ شوخ بندہ تو میرا مول خریدا نہیں نہیں
پوچھے ہے اس سے جب کوئی قتل نظیر کو کہتا ہے ہم نے مارا ہے ہاں ہاں، نہیں نہیں

تمام شعر تعریف سے بے نیاز ہیں۔ دوسرے شعر میں، ناز آفریں کہکر شاعر اپنے محبوب کی فوقیت ظاہر کرتا ہے اور پیرایۂ بیان نہایت دلآویز ہے۔ چوتھے شعر میں حسن کی شوخی و بیباکی کا کتنا صحیح نقشہ ہاں ہاں اور نہیں نہیں کی تکرار سے پیش کیا گیا ہے۔

غزل کے موازنہ کے سلسلہ میں دونوں کی سو قیانہ غزلوں اور شعروں کا بھی موازنہ ہو سکتا ہے لیکن غالباً یہ موازنہ کچھ زیادہ مناسب نہ ہوگا اور بالخصوص اس لئے کہ اس میدان میں دونوں برابر نظر آتے ہیں۔ صاحب گلشن بیخار نے میر کے اس رنگ کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ "پستنس بغایت پست است"

لیکن تعجب یہ ہے کہ میر کے پست اشعار پس پشت ڈال کر ان کو سراہا جاتا ہے اور نظیر کے لئے وہی چیز کلنگ کا ٹیکا ہو جاتی ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں :-

ملو ان دنوں ہم سے اک رات جانی کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جو

شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکے — کیا ساتھ نزاکت کے رگ گل سی کمر ہے
یار نے ہم سے بے ادائی کی، — وصل کی رات میں لڑائی کی
اتنی بھی کیا ہے دیدہ دلیری کہ غیر سے — آنکھیں لڑائے ہمیں آنکھیں دکھائے

نظیر کا یہ رنگ ملاحظہ ہو:

اک شب اے جانجاں گھر میں مرے رہ جائے — حال پر بندے کے ہوئی مہربانی آپ کی
کچلتے ہو مجھے تم میں یہ مانگوں ہوں دعا دل میں — کوئی دل بر میرے تمھیں بھی خوب سا کوٹے
دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا — بلور کی چوکی پہ جھلک نور کی سوجھی،
ہیں سب سے تو اے ماہ اشارات ولیکن — رہتی ہے بھری ابر دے خمدار ہمیں سے

اس کا فیصلہ اصحاب ذوق خود کر سکتے ہیں کہ دونوں کی پستی کس حد تک ہے اور دونوں اس کے باعث مجرم قرار دئے جا سکتے ہیں یا صرف ایک ہی۔

آخر میں ہم میر اور نظیر کے چند شعر جو قریب قریب ہم معنی یا ہم مضمون ہیں، پیش کرتے ہیں

نظیر — ۱۔ لیا ہے ہم سے دل و دیں بھی ہو طلب کرتے — دل اس تقاضے سے اپنا تو پیچ و تاب میں ہے
میر — رکھتی ہے مجھے خواہش دل بس کہ پریشاں — درپے نہ ہوا سو قت خدا جانے کہاں ہوں
۲۔ شور افگن جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا — رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبط آہ کرنا
میر — بلا ہے ایسا تپیدن دل کہ صبر اس پر ہے سخت مشکل — دماغ اتنا کہاں رہیگا کہ دست بر دل رہا کروگے
۳۔ دست صیاد سے چھوٹے تو اچھل پے در پے — ورنہ کیا فائدہ اے آہوئے دل جستوں سے
۴۔ ہمدم چھپا وے واں کوئی دل کی چاہ کو — شاید جہاں سمجھتے ہوں پہلی نگاہ کو
کہاں تک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ — ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا

نظیر — ۵۔ رو برو ہوئے جو چشمان بتاں سے لے دل — ڈرتے رہنا ہی تناسب ہے سیاہ مستوں سے
میر — میر ان نیم باز آنکھوں میں، — ساری مستی شراب کی سی ہے
نظیر — ۶۔ کچھ تو جاتا دل سے خار بیقراری کا خلش — کاش وہ نوک مژہ دیتی قرار ایک پل ہمیں،
نظیر — ۷۔ میں کیوں نہ پھولوں کہ اس گلبدن کے آنے سے — بہار آج مرے گھر میں ہے چمن کی سی
میر — آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے — کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے
نظیر — ۸۔ محفل میں جو دیکھا تو ادھر تم ہو خفا اور — ساقی کو بھی ہے حجت و تکرار ہمیں سے
میر — دیکھے ہے مجھے دیدہ پرخشم سے وہ میر — میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا
نظیر — ۹۔ گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہو اے خوباں — یہ رنگتیں ہیں تمھارے ہی پیرہن کی سی
میر — ہو جو تیرا سا رنگ گل کا بھی، — پرکھیں ہم تب جب ایسی بو بھی ہو
نظیر — ۱۰۔ یہ غنچہ جو بیدرد گلچیں نے توڑا — خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا

میر۔ ہر قطعہ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول کے بنائے

نظیر۔۱۱۔ آہ کے ساتھ مرے سینے سے نکلے ہے دھواں — اے بتاں مجھ دل بریاں سے کہو عشق اللہ

میر۔ نالہ ہمارا ہر شب گزرے ہے آسماں سے — فریاد پر ہماری کس دن تو کان دیگا

نظیر۔۱۲۔ جس کی آنکھوں نے کیا بزم دو عالم کو خراب — کوئی اس فتنۂ دوراں سے کہو عشق اللہ

میر۔ نگاہ مست نے اس کی لٹائی خانقہ ساری — پڑا ہے برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا

نظیر۔۱۳۔ ہمارے مرنے کو ہاں تم نہ جھوٹ سمجھے تھے — کہا رقیب نے لو اب تو اعتبار ہوا

میر۔ مرنے سے تم ہمارے خاطر نچنت رکھیو — اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں

نظیر۔۱۴۔ اوروں سے جو کہتے ہو کہ ہم ان سے ہیں ناخوش — اس کو تو فقط کرنا ہے اظہار ہمیں سے

میر۔ مدعی مجھ کو کھڑے صاف بُرا کہتے ہیں — چپکے تم سنتے ہو بولو اسے کیا کہتے ہیں

نظیر۔۱۵۔ خدا کے واسطے گل کو نہ مرے ہاتھ سے لو — مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

میر۔ گل میں اس کی جو بو آئی تو آیا نہ گیا — ہم کو بن دوش ہوا باغ سے لایا نہ گیا

میر اور نظیر کی شاعری کا وہ حصہ جس میں دونوں کا واقعتاً موازنہ کیا جا سکتا ہے نظموں کا ہے۔ اس لئے کہ دونوں نے کافی مواد اس صنف میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہاں نظیر کا پلہ میر سے بھاری نظر آتا ہے۔ نظیر نے کثرت سے ایسے عنوانوں کے ماتحت نظمیں لکھی ہیں جنھیں میر نے چھوا تک نہیں۔ میر کی شاعری کا مقصود ناکامیابی محبت کا رونا اور زمانہ کی شکایت تھی۔ اور ان کی نظموں میں جو مخمسات اور مثنویات کی شکل میں موجود ہیں سب میں اسی قسم کے تاثرات موجود ہیں اور چونکہ آپ بیتیاں ہیں اس لئے ان میں بھی وہی بلندی ہے جو غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ نظیر نے جو نظمیں لکھیں وہ صرف عشق و محبت کی داستانوں تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے اُردو شاعری کے اندر ایک ہی طرز کی بنیاد ڈالی جو ان سے پہلے مفقود تھی، ان کو فطرت کی طرف سے ایسا دل و دماغ عطا ہوا تھا جس میں مشاہدے کی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے مغربی شعرا کی طرح معمولی معمولی چیزوں پر نظمیں لکھی ہیں جن پر ایک عامی کی نگاہ بھی نہیں جاتی ہے اور ان سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ ان کی دقت نظر اور قوت استنباط کی زبردست شہادت ہے۔ جیسا کہ مضمون کے شروع میں نظیر کی خصوصیات کے ذکر کے سلسلہ میں ہم نے کیا ہے، نظیر کا کمال یہ ہے کہ جو بات اور جو واردات وہ پیش کرتے ہیں ان کو پڑھ کر انسان عجب مغالطہ میں پڑ جاتا ہے کہ آیا جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں واقعی ان پر گزرے ہوئے واقعات ہیں یا دوسروں کے واقعات ہیں جو انھوں نے چھپ کر دیکھے ہیں اور نظم کر ڈالے ہیں حقیقت یہ ہے کہ نظیر کی قوت مشاہدہ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ جس چیز کا ذکر کرتے ہیں اس کا ایک ایک تار الگ کر کے دکھاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظیر نقاد زندگی تھے۔ جنھوں نے حیات انسانی کا تجزیہ کر کے پیش کر دیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ جو نقوش جہاں سے اُجاگر کئے گئے ہیں آج تک ویسے ہی نمایاں ہیں اور ہمیں روزمرہ کی زندگی میں ملتے ہیں۔ آج بھی آٹے دال کا بھاؤ وہی ہے جو آج سے ایک صدی پہلے تھا۔ روپیہ کی اہمیت مفلسی کا رنگ میلوں ٹھیلوں کی دھوم دھام اور عشرت کدوں کے دھوم دھڑکے اسی طرح برپا نظر آتے ہیں جیسے نظیر کے مشاہدے کے وقت اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر کی نظمیں حال اور استقبال کا آئینہ ہیں، آج بھی شاہدان بازاری کی جلوہ گاہوں میں وہی نظارے دکھائی دیتے ہیں اور وہی دھبے پیش آتی ہیں جو نظیر کو پیش آئیں یا نظیر کے زمانے پیش آتی تھیں۔ اگر فرق ہوا تو صرف اتنا اور وہ بھی صاحب روح نظیر کی شہادت پر جو غالباً ناکافی ہے کہ نظیر نے مشاہدات اور تجربات سے فایدہ اُٹھایا اور خود بدل گئے درانحالیکہ آج وہی منظر پیش نظر ہونے کے باوجود طبائع اسے اثر پذیر ہونا پسند نہیں کرتیں۔

(پروفیسر) سراج احمد علوی (ام۔ اے)

عین الغزال

۱۸۶۲ء ہے اور نپولین ثالث، فرانس کا فرمانروا ہے۔ یہ بڑا اولوالعزم بادشاہ تھا اور ہر وقت اس فکر میں رہتا تھا کہ یورپین اقوام کا اثر میکسیکو تک پہونچ جائے، جو شمالی امریکہ کے انتہائی جنوب میں ایک آزاد حکومت تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سعید پاشا خدیو مصر تھا، چنانچہ نپولین نے سعید پاشا کو لکھا کہ اپنی سوڈانی فوج اس کے پاس بھیجدے تاکہ وہ اور فرانسیسی افواج دونوں ملکر میکسیکو پر حملہ کریں۔

خدیو نے اس درخواست کی تعمیل میں حبشی سوڈانیوں کی ایک فوج جبریت اللہ کی قیادت میں روانہ کردی۔ اس فوج نے میکسیکو میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے اور بہت سے معرکے سر کئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ان میں سے اکثر مصر واپس آگئے، لیکن ایک سپاہی وہیں رہگیا اور اپنے وطن واپس نہ آیا۔ اس کا نام محمد مرجان تھا۔

یہ لڑائی کئی سال تک جاری رہی اور تقریباً ہر معرکہ میں مرجان بھی شریک رہا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۳ء کا معرکہ اس جنگ کا بڑا سخت تھا جس میں میکسیکو کی فوج نے جان توڑ کر مقابلہ کیا، لیکن سوڈانی فوج کے مقابلہ میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگ نکلے۔ سوڈانیوں نے آدھی رات تک ان کا پیچھا کرکے بالکل منتشر کردیا اور مظفر و منصور واپس آئے۔ لیکن ان واپس آنے والوں میں مرجان نہ تھا، کیونکہ یہ پہلے ہی زخمی ہوکر ایک گڑھے میں گر گیا تھا اور نتیجہ کا منتظر تھا۔

اسے خیال تھا کہ جب سوڈانی فوج لوٹے گی تو وہ اسے بھی ڈھونڈھکر ساتھ لے لیگی، لیکن چونکہ واپسی رات کی تاریکی میں ہوئی تھی اس لئے نہ کسی اور نے اس کو دیکھا، نہ یہ کسی کو پکار سکا، کیونکہ پچھلے پہر کو اس کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ چاروں طرف لاشیں پڑی ہوئی ہیں اور صحرائی جانور ان کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تمام میدان گندگی و عفونت سے بھرا ہوا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ بھی ختم ہو جائے، کیونکہ چلنے کی اس میں سکت نہ تھی اور یہ منظر اس سے دیکھا نہ جاتا تھا۔

دیر تک وہ اسی حال میں مبتلا رہا، لیکن بعد کو اس نے سوچا کہ جب تک جان باقی ہے کیوں نہ زندہ رہنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ بمشکل تمام وہ اٹھا اور ایک لکڑی توڑ کر اس کے سہارے سے چل پڑا، مگر زخموں سے چور، کئی دن کا بھوکا پیاسا، کب تک چل سکتا تھا، آخر کار وہ تین گھنٹہ تک چلنے کے بعد تھک کر گر پڑا اور مایوس ہوکر ہاتھ پاؤں ڈال دئے۔

صبح صادق کا وقت تھا اور ریڈ انڈین لڑکیاں اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے نکل پڑی تھیں۔ انھیں میں ایک لڑکی اُس گاؤں کی بھی تھی جس کے قریب مرجان پڑا ہوا تھا۔ اس لڑکی کا نام اصل زبان میں تو کچھ اور تھا، لیکن مفہوم کے لحاظ سے اسے "عین الغزال" کہہ سکتے ہیں۔ یہ لڑکی لالہ کے پھول چننے کے لئے نکلی تھی، اور یہ اس کا روز کا معمول تھا

کہ پھول چن کر بازار لیجاتی اور جو قیمت ملتی وہ اپنے ماں باپ کو لیجا کر دیدیتی۔

وہ پھول چُن ہی رہی تھی کہ ناگاہ شاخوں کے اندر سے اُسے دو خونیں آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں اور اسی کے ساتھ پھنکار کی آواز بھی اس کے کان میں آئی — مکسیکو میں ایک نہایت زہریلے قسم کا سانپ ہوتا ہے جس کے زہریلے وہاں کے لوگ اپنے تیر بجھا لیتے ہیں اور دشمن کو ان سے ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

لڑکی سانپ کو دیکھ کر گھبرا گئی اور چاہا کہ پیچھے ہٹ کر اپنی جان بچائے کہ دفعتاً اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے ایک گڑھے میں گر گئی۔ یہاں اس نے سانپ سے زیادہ ایک خوفناک چیز دیکھی۔ یعنی سوڈانی سپاہی — یہ مرجان تھا۔

مرجان اس کی پریشانی کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ کیوں گھبرا رہی ہے اور اس نے اُس کو اطمینان دلانا چاہا، لیکن چونکہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا تھے، اس لئے صحیح مدعا تو کوئی نہ سمجھ سکا، لیکن اشاروں سے یہ بات ضرور سمجھ میں آگئی کہ دونوں ایک دوسرے کی ہمدردی کے لئے طیار ہیں۔

لڑکی، سہارا دیکر اسے گھر لیگئی اور اس کے ماں باپ نے بہت محبت سے اس کی تیمارداری شروع کی، یہانتک کہ وہ اچھا ہونے لگا، لیکن وہ جتنا اچھا ہوتا جاتا تھا، اتنا ہی وہ اپنے کو بیمار محسوس کرتا جاتا تھا، کیونکہ پہلے تو صرف اس کا جسم مجروح تھا، لیکن اب اس کا قلب زخمی تھا۔ "عین الغزال" کے اُن تیروں سے جنھیں وہ چلانا تو جانتی تھی لیکن ان کے زہر سے ناواقف تھی۔

اہل مکسیکو اور فرانس میں یہ لڑائی پانچ سال تک برابر جاری رہی۔ اور نپولین نے اس آزاد قوم کو غلام بنانے کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اُٹھا رکھا، لیکن مکسیکو کے باشندوں کی آزاد روح نے غلامی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آخر دم تک دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ آخر کار جب نپولین کو یقین ہو گیا کہ وہ اس مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتا، تو اس نے مارچ ۱۸۶۷ء میں حکم جاری کیا کہ جتنی فرانسیسی اور سوڈانی فوجیں مکسیکو میں موجود ہیں وہ واپس آئیں اور اس طرح استبداد و آزادی کی یہ جنگ آزادی کی فتح پر ختم ہوئی۔

جب سوڈانی فوج کے تمام افراد واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مرجان ان میں نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے مکسیکو کے فرمانروا سے اجازت لیکر وہیں قیام کر لیا تھا اور عین الغزال سے شادی کرنے کے بعد باشندۂ مکسیکو کے تمام حقوق اسے حاصل ہو گئے تھے

جس وقت فرانس کی فوجیں مکسیکو سے واپس گئیں تو آسٹریا کا ایک سردار مکسمیلان معہ اپنی فوج کے یہاں رہگیا تھا اور وہ اپنی حکومت قایم کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں بھی بہت سی لڑائیاں اہل مکسیکو نے لڑیں اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ آزادی قوت ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مکسیکو کی تاریخ بتاتی ہے کہ بعد کو تقریباً تین سو لڑائیاں اور یہاں کے باشندوں نے لڑیں اور ان میں کوئی لڑائی ایسی نہ تھی جس میں مرجان اور عین الغزال کی اولاد نے حصہ لیا ہو۔

شوکت جہاں

مومن کی غیر مطبوعہ غزلیں

یہ غزلیں ہمیں مولانا عرشی کی وساطت سے حاصل ہوئی ہیں جو کتاب خانہ رامپور کے ناظم ہیں - یہ غزلیں متداول مطبوعہ و قلمی نسخوں میں نہیں ہیں اور صرف ایک قلمی نسخہ میں پائی جاتی ہیں جو رامپور کے کتاب خانہ میں موجود ہے -

---

۱-

کوچہ میں بستر آپ کے شام اور کا ہوا — اپنا جو تھا مقام، مقام اور کا ہوا
تھا تم کو مجھ سے ربط تو تم سے مجھے بھی تھا — تم اور کے ہوئے تو غلام اور کا ہوا
یہ چشم پوشی، آپ کو شب نیند آگئی — وہ ہیں کہ بس فسانہ تمام اور کا ہوا
دن رات وہ ہے غیر ہے اور تازہ اختلاط — اب کا ہے کو گزر لب بام اور کا ہوا
ہم اپنے ہونٹ چاٹتے ناکام رہ گئے — حاصل لبوں سے آپ کے کام اور کا ہوا
دل تو عبث ہے دشت تمنا نورد اب — وہ آہوے رمیدہ تو رام اور کا ہوا
دام اجل میں پھنس گیا آتے ہی جال میں — صیاد صید میں تہ دام اور کا ہوا
رہنے لگا ہے خانۂ دل میں غم فراق — رہتے تھے تم جہاں وہ مقام اور کا ہوا

جانباز مومن اُس نے دیا غیر کو خطاب
ہم جان پر بھی کھیلے پہ نام اور کا ہوا

۲-

سینہ سے، منفعل ہے کھڑا، تیر کھینچ کر — ایک آہ، مرگیا ہے جو نخچیر، کھینچ کر
بیتابی دل کی لے اُڑی، صیاد نے ہزار — باندھے تھے بال مرغ ہوا گیر کھینچ کر
ہے رنج دست غیرت ہمت سے وصل میں — جی سے خفا ہوں منت تقدیر کھینچ کر
بے طاقتی سے اب تو یہ احوال ہے کہ ہم — نالہ بھی، غش سے رہتے ہیں تا دیر، کھینچ کر
میں تشنہ کام آب شہادت ہوں، کاشکے! — وہ کافر آئے سامنے شمشیر کھینچ کر
مژدہ جنوں بہار کا دکھلائے ہے مجھے — چشم خیال نقشۂ زنجیر کھینچ کر
تم آج تک نہ آتے، اگر آتے آپ سے — لائی ہے میرے نالے کی تاثیر کھینچ کر
بیماری تب غم ہجراں میں اب کی بار — یہ ناتواں ہوں مومن دلگیر کھینچ کر
آتا نہیں ہے جو ورق سادہ کچھ نظر — (قطعہ) بہزاد ڈھونڈے ہے مری تصویر کھینچ کر

۳- غم کو ہم سے ربط ہے مدت سے ہم کو غم سے ربط
ہم اُسی سے ربط رکھتے ہیں جو رکھے ہم سے ربط

اُف رے سوز گریۂ غم تیری دولت سے مدام
دامن دوزخ کو ہے مژگان چشم نم سے ربط

اس دل صد چاک کو کیوں کر نہ ہووے پیچ و تاب
شانہ رکھتا ہے کسی کے کاکل برہم سے ربط

دل سے پیوستہ ہیں یوں داغ غم ہجراں مرے
جس طرح ہووے نگیں کو خانۂ خاتم سے ربط

ہائے رشک شمع و گل تو ہو گریزاں مجھ سے اور
شمع کو پروانے سے ہو گل کو ہو شبنم سے ربط

آہ سے روشن ہے مضمونِ غم و دردِ نہاں
کیا عبارت کو دیا ہے معنی مبہم سے ربط

ہم مزاجی دوستی کا ہے سبب کیا ہے عجب
گر رکھے تیغ قضا اُس ابروے خوش خم سے ربط

اس طرف کو بھی ہے میلانِ طبیعت اندنوں
بعد مدت اُن کو پھر ہوتا چلا ہے ہم سے ربط

میں تو دیوانا ہوں مومن کا کہ ہے اُس شخص کو
اس قدر وحشی مزاجی پر بھی ایک عالم سے ربط

۴- لوگ کیا جانیں ہیں سوز شمع و پروانے کا حظ
کوئی پوچھے میرے جی سے ہائے جل جانے کا حظ

سامنے آتے ہی ہو جانا نہاں کس واسطے ؟
چھیڑنے کا میرے حاصل تیرے ترسانے کا حظ

گر سنیں گاہے نوائے دلخراش عاشقاں
بھول جائیں آپ لذت راگ کی گانے کا حظ

ڈوب جاتا زہر کھاتا جان دیتا ہر طرح،
خضر کو ہوتا اگر معلوم مر جانے کا حظ

چکھتے ہیں سوزِ محبت کا مزا لذت نصیب
تجھ سے اے ناصح کہے کیا کوئی غم کھانے کا حظ

ہم نہ کہتے تھے وہ ہنس کر اور چھڑکے گا نمک
کیوں دل مجروح دیکھا زخم دکھلانے کا حظ

ہے ہجوم تاک اپنی خاک پر پیر مغاں
بعد مردن بھی ہے باقی ہم کو میخانے کا حظ

جذب دل تو جانتا ناصح نہیں کس سے کہوں
فایدہ ہر دم کی بیتابی کا گھبرانے کا حظ

مومن ببدین کب چلتا ہے طوف کعبہ کو
پڑ گیا ہے اُس کو زاہد طوف بتخانے کا حظ

ترے درد ہجر میں کب تلک پڑے تڑپیں آٹھ پہر تلک
دم صبح سے سر شب تلک سر شب سے لیکے سحر تلک

مرے جینے سے جو تو ہو غمیں تو لگا یہ شوق سے تیغ کیں،
کہ عزیز تجھ سے تو جاں نہیں نہ دریغ تجھ سے ہے سر تلک

زہے دشت عشق کہ آہ یہاں ہوئے کیسے لوگ تباہ یہاں
یہ عجب ہو جائے کہ راہ یہاں سبھی بھولتے ہیں خضر تلک

مرے نالہ پر تو ہنسے ہے کیا اسی سے بر آئیگا مدعا
کہ تو دیکھنا جو پہونچ گیا کسی روز گوش اثر تلک

دم گریہ کس لئے یاس تھی، سنی کس سے پھر خبر خوشی
مری جان کس لئے پھر گئی ابھی آکے دیدۂ تر تلک

نہ خیال سیر ارم کبھو نہ بہشت کی ہمیں جستجو
یہی ہے ہوس یہی آرزو کہ گزار ہو ترے در تلک

مرے حال کی اُسے کیا خبر کہ وہ رحم کھا کے ہو چارہ گر
کوئی نامہ بر نہ پیام ہے کہ وہ جائے یار (کے) گھر تلک

مرا نامہ دے اُسے یا کہے کہ ذرا تو جا کے خبر تو لے
کہ ترا مریض ہر آن سے ہے کچھ اور آن دگر تلک

کبھو تکیہ سے نہ اُٹھانا سر، پڑے رہنا بیخود و بے خبر
کبھو ہوش ہے کوئی دم اگر تو غشی ہے دو دو پہر تلک

شب ہجر غم سے ہی جاں بلب نہ بتنگ ہم سے ہو مومن اب
کہ ہیں میہماں ترے شب کی شب نہیں بچنے آج سحر تلک

کہے ہے کون رکھو مرہم زنگار پر رکھو
نہیں رکھتے تو خنجر ہی دل افگار پر رکھو

مرے مرقد پہ کیا ہے کام شمع و گل کا اے یارو
یہاں پروانہ و بلبل کے ایک دو چار پر رکھو

طبیبو زہر بھی دیدو کہیں بس مٹ چکے قصہ
روا مت نزع کی تلخی دل بیمار پر رکھو

بُرا ہے سر چڑھانا بے وفاؤں کا کہا مانو
سنا مت طرۂ گل گلرخو دستار پر رکھو

رولانا مجھ کو کب تک پوچھتے اغیار کے آنسو
کبھی دامن مرے بھی دیدۂ خونبار پر رکھو

ذرا حسرت نکلنے دو خدا کے واسطے یارو
مرے لاشے کو ایکدم آستانِ یار پر رکھو

چلا جاتا ہے بتخانے میں اے زہاد بھولے سے
گماں کچھ اور مت تم مومن دیندار پر رکھو

نکسول

استعمال کرنے والے لوگ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے

اس لئے کہ

نکسول تمام مضر صحت اجزا سے پاک ہے، اس میں جو اجزا استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت قیمتی ہیں، ان کے زندگی بخش خصائص حکیموں اور ڈاکٹروں کے نزدیک مسلّم ہیں، یہی وجہ ہے کہ نکسول کو بوڑھے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور جوان بھی، اور سب بقدر ظرف فایدہ اُٹھاتے ہیں، آپ بھی تجربہ کیجئے۔

قیمت
بڑی شیشی ..... آٹھ روپے
چھوٹی شیشی ..... تین روپے چار آنے

نیشن اینڈ ایلیس
پراسپکٹ چیمبرس انیکس
فورٹ - بمبئی

فلمی دُنیا کی زندگی

بہت مشہور مثل ہے کہ "ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہے" اور اس کا صحیح ترین مصداق غالباً فلمی دنیا کی زندگی ہے۔ جسوقت ہم رسایل و جرایدمیں مشہور ممثلین کی تصویریں دیکھتے ہیں، تو سمجھتے ہیں کہ ان سے زیادہ شہرت کی عمدہ صورت اور کیا ہوسکتی ہے، جب ہم زرق برق لباس کے ساتھ ان کو فلم میں حرکت کرتے، ہنستے بولتے، کھیلتے کودتے دیکھتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ خوش قسمت، ان سے زیادہ خوشحال اور ان سے زیادہ مسرور زندگی کس کی ہوسکتی ہے اور ہم میں سے بعض جنمیں تعلیم یافتہ مرد و عورت دونوں شامل ہیں اس رنگ و روغن اور نمود و نمایش سے فریب کھا کر فلمی دنیا کی زندگی اختیار بھی کرلیتے ہیں، لیکن یہ حقیقت وہاں پہونچنے کے بعد ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ شہرت و دولت کتنی گریزپا اور یہ مسرت کتنی جھوٹی ہے۔

خیر، ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا جہاں دولت و مسرت کا معیار بہت گرا ہوا ہے، لیکن آپ یہ سنکر حیرت کریں گے کہ امریکہ یعنی ہالی ووڈ میں بھی جو کعبۂ فلمسازی سمجھا جاتا ہے، حالت کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

مشہور بات ہے کہ ہالی ووڈ، مملکت سینما کا پایۂ تخت ہے، جہاں عیش و مسرت کا دریا موجزن ہے جہاں کواکب سینما بادشاہوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جہاں باغ ہیں۔ تفریح گاہیں ہیں، کشادہ سڑکیں ہیں، کھیل کود کے لئے بڑے بڑے میدان ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو انسانی زندگی کو فردوسی زندگی بنا سکتا ہے، لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس بہشت کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جہاں فقر و افلاس اور مایوسی و ناکامی کی جہنمی زندگی کے علاوہ کچھ نہیں۔

ہزاروں نوجوان لڑکیاں اور خدا جانے کتنے نوجوان مرد اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر یہاں آتے ہیں اور یہ یقین لیکر آتے ہیں کہ ہالی ووڈ پہونچتے ہی وہاں کے تمام کارکن ان کی طرف دوڑ پڑیں گے اور دولت و شہرت اُن کے قدموں پر نثار ہونے لگے گی لیکن یہاں پہونچنے کے بعد انھیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے سخت فریب میں مبتلا تھے اور آخر کار انھیں پیٹ پالنے کے لئے نہایت ادنیٰ قسم کی خدمات انجام دینا پڑتی ہیں اور بعض کو تو اس کا بھی موقعہ نہیں ملتا اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

یہاں ایک جماعت ان لوگوں کی بھی ہے جو کسی وقت سنما کے کواکب تھے اور دولت ان کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی، لیکن بعد کو ان کی جگہ دوسرے کواکب نے لیلی اور اب ان کی حالت یہ ہے کہ بہ قدر کفاف بھی انھیں میسر نہیں آتا۔

خود ہالی ووڈ پر بھی کبھی کبھی تنگ وقت آتے ہیں یہاں تک کہ اس کے بنکوں کی ساکھ بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں کے کام کرنے والے بھی جن کا روپیہ وہیں کے بنکوں میں جمع رہتا ہے، مفلس و محتاج ہوجاتے ہیں۔

ہالی ووڈ پر اس قسم کا سخت وقت ایکبار ۱۹۳۱ء میں آیا تھا جب دفعتاً اس کے دو بنکوں کا دیوالہ نکل گیا اور اکثر ایکٹروں کی دولت جو دو سال کی مدت میں انھوں نے وہاں جمع کی تھی چشم زدن میں تباہ و برباد ہوگئی اور وہی کواکب جن کو بغیر موٹر کے ایک قدم چلنا دشوار تھا، پیادہ پا چلنے لگے اور اپنے محلات فروخت کرکر کے جھونپڑوں میں رہنے لگے۔ چنانچہ ایک

مشہور انگریزی ایکٹر کا واقعہ بتایا جاتا ہے کہ وہ صبح کو اپنی بیوی کے ساتھ موٹر پر تفریح کے لئے جا رہا تھا کہ دفعتاً اس کے کسی دوست نے خبر کی کہ فلاں فلاں دو بنکوں کا دیوالہ نکل گیا ہے، اس نے چاہا کہ فوراً وہاں پہونچکر اس کی تصدیق کرے۔ موٹر میں پٹرول کم تھا، چاہا کہ کسی دوکان سے پٹرول حاصل کرے، چونکہ وہاں ہر چیز کی قیمت خواہ کتنی ہی کم ہو چک کے ذریعہ سے ادا کی جاتی ہے اور جن بنکوں میں اس کا روپیہ جمع تھا وہاں کے چکوں کی اب کوئی قیمت نہ رہ گئی تھی، اس لئے اسے پٹرول نہ ملسکا اور اسے پیدل وہاں تک جانا پڑا۔

ہالی ووڈ کی صنعتِ فلمسازی کے متعلق ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ وہاں ایکٹروں سے برسوں کے لئے ٹھیکہ ہو جاتا ہے اور بڑی بڑی رقمیں انھیں ادا کی جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض نہایت ہی مشہور اداکاروں کے ساتھ یہ رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہو، لیکن عام طور پر روزانہ اُجرت پر کام لیا جاتا ہے اور یہ اُجرت چند گنی سے زیادہ نہیں ہوتی۔

وہاں معمولی فلم کی طیاری میں پانچ ہفتے اور بڑے سے بڑے فلم کی طیاری میں آٹھ ہفتے صرف ہوتے ہیں اور اس مدت میں ہر اداکار کا کام چند دن سے زیادہ نہیں ہوتا، اس لئے اگر ان کی اُجرت ۱۳۰ گنی ہفتہ وار ہو تو بھی یہ رقم سیکڑوں سے آگے نہیں بڑھتی، بعض فلموں میں بعض اداکاروں کو صرف ایک ہی دن کام کرنا پڑتا ہے اور ان کو ایک ہی دن کی اُجرت ملتی ہے۔ یقیناً یہ حال متوسط درجہ کے اداکاروں کا ہے، لیکن ان کی تعداد وہاں ۵۰ فی صدی سے کم نہیں ہے اور اسلئے ہالی ووڈ کے نصف اداکار تو یقیناً انتہائی عُسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ رہے باقی نصف، سو ان کی معاشرت اتنی بلند ہے کہ وہ قارون کا خزانہ ملنے کے بعد بھی کبھی خوشحال نہیں کہے جا سکتے۔

یہ تو ہوئی یہاں کی مالی حالت جس کی طمع میں لوگ کھنچ کھنچ کر یہاں پہونچتے ہیں، رہا دماغی و قلبی سکون سو اس کا ذکر فضول ہے، کیونکہ یہی ایک چیز ایسی ہے جو فلمسازی کی دنیا میں کسی کو میسر نہیں۔

ہندوستان کی صنعت فلم سازی بھی بہت ترقی کر رہی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ نوجوان مرد و عورت جو ذرا بھی سُن صورت یا حُسن صوت رکھتا ہے، فلم میں جانے کی تمنا رکھتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہاں کی دولت و شہرت کہیں زیادہ ناپایدار ہے اور اخلاق کا تو خیر ذکر ہی کیا جبکہ شاید اکثر اداکار یہاں اسی لئے جاتے ہیں کہ انھیں اپنے اخلاق خراب کرنے کا سب سے زیادہ موقع یہیں حاصل ہے۔

یہاں کی فلم ساز کمپنیاں باوجود ترقی کرنے کے بھی ابھی تک اس منزل سے نہیں گزریں، جہاں کمال کا سودا صرف روپیہ کمانے کے لئے کیا جاتا ہے اور چونکہ یہاں نہ کمال ہے نہ کمال کی خودداری، اس لئے سودا کرنے والوں کے لئے یہ جنس فردما یہ ہر جگہ ملجاتی ہے۔

دُنیا میں اصل چیز روح و قلب کا سکون اور ضمیر کا اطمینان ہے، اگر ہم ان کو ضایع کرنے کے بعد دولت جمع کر بھی لیں تو اس سے کوئی لطف نہیں اُٹھا سکتے، رہا معاملہ حُسن و شباب اور اس سے لذت اندوز ہونے کا، سو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ فلمی دنیا میں اس کا بھی کیا موقعہ ہے، جبکہ وہاں شراب کا ہر نوش، ایک نیش اور شباب کی ہر تمنا ایک خلش دلریش سے زیادہ نہیں۔

شوکت جہاں

وقت سے پہلے اور بعد

بعض بچے ایسے ہوتے ہیں جن کا نشو و نما عمر کے لحاظ سے زیادہ ہو جاتا ہے اور نہایت کمسنی میں وہ ایسی ہوشیاری و ذہانت کی باتیں کرنے لگتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے بعض بچے ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن کا جسمانی و ذہنی نشو و نما بہت دیر میں ہوتا ہے اور اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ ناسمجھ معلوم ہوتے ہیں۔

اول الذکر قسم کے بچّوں کے والدین اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اُن کی اولاد ابتدا ہی سے اس قدر ذہین ہے اور دوسرے قسم کے بچّوں کے ماں باپ یہ دیکھ کر افسردہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی اولاد بلید الذہن ہے، لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ دونوں غلطی کرتے ہیں۔ نہ اُنھیں خوش ہونے کا موقعہ ہے، نہ ان کو رنج و ملال کا، کیونکہ جو بچّے ابتداء عمر میں غیر معمولی نشو و نما کے آثار رکھتے ہیں، اُن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ بڑے ہونے کے بعد بھی ذہین رہیں اور جو بچّے شروع میں کند ذہن نظر آتے ہیں، وہ جوان ہونے پر بھی ویسے ہی رہیں

لی ہنٹ اپنی ابتدائی تعلیم کے وقت اس قدر کند ذہن تھا کہ پہاڑا اسے کبھی یاد نہ ہو سکا۔ جب سن بلوغ کو پہونچا تو دفعتاً اس کی ذہانت چمک اُٹھی، یہاں تک کہ وہ اپنے زمانہ کا بہت مشہور نقاش ہوا۔

گولڈ اسمتھ انگریزی زبان کا نہایت مشہور شاعر تھا۔ لیکن زمانۂ طالب علمی میں اس کی یہ حالت تھی کہ تمام استاذ صدر جہ غبی جانتے تھے اور اس کی طرف سے بالکل مایوس تھے۔

ڈاروین، جس نے اپنے نظریۂ ارتقاء کی وجہ سے بقاء دوام حاصل کیا، اپنے بچپن میں علم کی طرف سے اتنا بد شوق واقع ہوا تھا کہ اس کا باپ کہا کرتا تھا کہ سوائے شکار کھیلنے اور کتّے پالنے کے یہ کچھ نہ کرے گا۔

لارڈ بیرن، انگریزی زبان کا نہایت ممتاز شاعر تھا، لیکن اس کی شاعرانہ اہلیت پختگی عمر کے بعد ہی ظاہر ہو سکی۔

ڈیوک آف ولنگٹن کا باپ اسے ہمیشہ "غبی لڑکا" کہکر پکارا کرتا تھا اور پروفیسر انیشٹین جو نظریۂ اضافیت (Rela-tivity) کا موجد ہے اور اس عہد میں ریاضی کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، بچپن میں اتنا غبی تھا کہ ریاضی کے امتحان میں کبھی کامیاب نہ ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ بعض بچّے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں ابتداء ہی سے ذہانت کے حقیقی آثار پائے جاتے ہیں جو عمر کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں مثلاً جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے کہ صرف نو سال کی عمر میں وہ جرمن، فرانسیسی، لاطینی اور یونانی زبانوں کا ماہر ہو گیا تھا۔ یا ڈاکٹر ٹامس ینگ کہ دو سال کی عمر میں اسے لکھنا پڑھنا آ گیا اور چار سال کی عمر تک اس نے دو مرتبہ پوری انجیل کا مطالعہ کیا۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ انسان میں عقل انسانی کا کمال ۴۶ سال کی عمر میں ہوتا ہے، لیکن اس کے آثار بیس سال کے بعد ہی پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر غیر معمولی واقعات و حوادث پیش نہ آئیں تو ہم توقع کر سکتے ہیں کہ وہ انسان جس نے

بیس سال کی عمر میں کس غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا ہے، چالیس سال کی عمر تک ضرور کوئی نہ کوئی نمایاں کام انجام دے گا۔

طبیعی و فطری حالات میں ایک بچّہ کے نشو و نما کا تدریجی سلسلہ یوں قایم ہوتا ہے کہ دوسرے اور چوتھے مہینے کے درمیان اس کا سر قایم ہو جاتا ہے اور تیسرے پانچویں مہینے کے درمیان وہ ہنسنے لگتا ہے۔ اسی طرح پانچویں اور ساتویں مہینے کے اندر اندر اس میں اتنی حس پیدا ہو جاتی ہے وہ اپنے کھلونوں کو پکڑ سکے اور آٹھویں یا نویں مہینے بیٹھ سکے۔ ایکسال تک پہونچتے پہونچتے وہ کھڑا ہونے لگتا ہے، سوا سال کے بعد بغیر کسی سہارے کے چل سکتا ہے اور ایک آدھ لفظ اپنی زبان سے ادا کرنے لگتا ہے اور ڈیڑھ دو سال کی عمر میں چھوٹے چھوٹے فقرے بولنے کی اہلیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اگر یہ تمام باتیں وقت سے پہلے یا بعد از وقت ظاہر ہوں، تو بیشک طبیعی حالات سے ہٹی ہوئی سمجھی جائیں گی لیکن ذہانت یا بلادت سے ان باتوں کا زیادہ تعلق نہیں ہے اور کارگاہِ فطرت میں ہم کو بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ غیر معمولی حالات کو دیکھ کر انسان نے جب کوئی حکم لگایا، نتیجہ اس کے خلاف نکلا اور ٹھیک اس وقت جبکہ وہ اپنے سازگار حالات سے مطمئن تھا، آخر کار اسے اپنی غلطی محسوس کرنا پڑی۔

مجدّد نیازی

حضرت نیاز فتحپوری کی بعض جدید کتابیں

زیر طباعت ہیں

حُسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے پچیس افسانے ہیں جو اسوقت تک کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے اور حُسن بیان و لطافت انشار کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ضخامت اندازاً پندرہ جزو۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز دوسرا حصّہ یہ حصّہ بھی پہلے حصّہ کے برابر ہے، لیکن اُس سے زیادہ رنگین، اُس سے زیادہ مفید و دلکش۔ اس مجموعہ کے اکثر خطوط انتقادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قیمت تین روپیہ

انتقادیات حضرت نیاز کے تمام انتقادی مقالات و شذرات کا مجموعہ جو ادب اُردو کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے دائرۃ المعارف کا حکم رکھتا ہے۔ بعض عنوانات کی فہرست ملاحظہ ہو:

شعر۔ ڈراما و رومان۔ فن تنقید۔ اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزلگوئی پر عہد بہ عہد تبصرہ۔ اُردو شاعری کا تدریجی ارتقار۔ میاں نظام شاہ رامپوری۔ کلام مومن، جاوید مرحوم۔ لکھنؤ کے عہدِ شباب کی ایک شاعرہ۔ ظفر کی شاعری نواب آصف الدولہ۔ نظیر اکبرآبادی۔ جوش ملیح آبادی کی شاعرانہ لغزشیں۔ جناب بیمار کا کارنامہ۔ اصغر گونڈوی کی شاعری۔ اقبال۔ اکبر۔ طنزیات فارسی۔ عربی کی عشقیہ شاعری۔ مثنوی کی بحریں۔ شیفتہ وغیرہ وغیرہ۔ ضخامت اندازاً ۲۵۰ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔ علاوہ محصول

(نوٹ) ان کتابوں کی قیمت پیشگی وصول ہونے پر محصول ڈاک معاف۔

منیجر نگار

مطبوعات موصولہ

پریم کی چوڑیاں مجموعہ ہے جناب ڈاکٹر اعظم کریوی کے بارہ افسانوں کا جسے مکتبۂ دانش محل لکھنؤ نے نہایت خوبصورت سائز پر نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔

ڈاکٹر اعظم ملک کے ان چند مخصوص فسانہ نگاروں میں سے ہیں، جن کا مقصود ملک کے ادنیٰ و اوسط طبقہ کے ہر پہلو کو نمایاں کرکے اس کی اصلاح کرنا ہے۔ زبان، پلاٹ اور طرز ادا کے لحاظ سے یہ افسانے انھیں تمام خصوصیات کے حامل ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے دوسرے مقبول فسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر فسانے مختلف رسایل میں شایع ہوکر خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ قیمت دو روپیہ

پرچھائیاں جناب حامد اللہ افسر میرٹھی کے دس فسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے بھی معاشرتی ہیں اور نہ صرف تجزیۂ جذبات و کردار، بلکہ اپنی سلاست زبان و حلاوت بیان کے لحاظ سے بھی بہت دلکش ہیں۔ افسر صاحب اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت سلجھے ہوئے انسان ہیں اور جذبات سے مغلوب ہوکر کام کرنے والے نہیں ہیں ان افسانوں کے مطالعہ سے مصنف کی ان خصوصیات پر کافی روشنی پڑتی ہے اور وہ حضرات جو فسانوں میں سنجیدہ مطالعہ کے عادی ہیں ان کے لئے یہ مجموعہ کافی دلکش ثابت ہوگا۔ ملنے کا پتہ: دانش محل لکھنؤ۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

یاران میکدہ جناب عبدالشکور رام۔ اے کی تصنیف ہے جس میں کردار نگاری کے اصول پر ان کے چند مقالے یکجا کردئے گئے ہیں، نفسیاتی انتقاد بڑی مشکل چیز ہے اور دلچسپ بھی، لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ فاضل مصنف نے نہایت کامیابی کے ساتھ اس فرض کو ادا کیا ہے۔ طرز تحریر میں مزاحیہ رنگ بھی ہے اور گہرائی بھی، سنجیدگی بھی اور ادبی لطافت بھی۔ ان تیرہ مقالوں میں کوئی ایک مقالہ بھی ایسا نہیں جسے ہم معیار سے گرا ہوا کہہ سکیں۔ ملنے کا پتہ کتاب خانہ دانش محل۔ امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ

بربط شکستہ مجموعہ ہے انجم صہبائی، سحر صہبائی، جاوید یزدانی، آزاد صحرائی اور ساغر میمنائی کے دو دو افسانوں کا۔ یہ پانچوں حضرات حیدرآباد کے خوش فکر نوجوانوں میں سے ہیں اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ ادارۂ نشر اردو۔ محبوب پورہ۔ حیدرآباد دکن۔

یقین و عمل وائی کونٹ سموئیل کی ایک کتاب ہے (Belief & Action) مسٹر سموئیل برطانوی انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی کے صدر ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیر بحث کتاب انکی مشہور تصنیف ہے جس میں فلسفۂ اجتماع یا نفس مسئلۂ اجتماعیت پر بحث کی گئی ہے۔ سب سے پہلے موجودہ بحرانی دور کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر چودہ ابواب میں سائنس، مذہب، فلسفہ اور معاشیات کو سامنے رکھ کر عمل کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب کا ملخص یقین وعمل کے نام سے مولوی عبدالقدوس ہاشمی نے پیش کیا ہے، ہاشمی صاحب نے جابجا اختلافی نوٹ بھی دئے ہیں، کہیں معقول اور کہیں غیر معقول، خاص کر مذہب کے سلسلہ میں، جو کچھ ہاشمی صاحب نے لکھا ہے وہ مولویانہ ہٹ سے زیادہ نہیں۔ سموئیل کا خیال ہے کہ مذہب میں ضرورت زمانہ کے لحاظ سے تغیر وتبدل ہونا چاہئے، ہاشمی صاحب دوسرے مذاہب کے باب میں تو اس نظریہ کی صحت تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسلام کے متعلق وہ اس کو ماننے کے لئے طیار نہیں، کیونکہ اسلام اُن کے نزدیک بالکل اُصول عقل کے مطابق ہے اور اس نے ہمیشہ زمانہ کا ساتھ دیا ہے۔ اگر ہاشمی صاحب بغیر اس اختلافی نوٹ کے سرسری طور پر اس مقام سے گزر جاتے تو بہتر تھا، لیکن اگر ان کی حمیت اسکو گوارا نہ کرسکتی تھی تو پھر انھیں پوری قوت کے ساتھ اپنے دعوے کو ثابت کرنا چاہئے تھا۔

یہ کہنا کہ اسلام عقلی معیار پر پورا اُترتا ہے، اس تمام لٹریچر کی تکذیب ہے جو روایات کے نام سے مسلمانوں کا دین وایمان بنا ہوا ہے اور جس سے روگردانی کی ہمت ہاشمی صاحب میں بھی نہیں ہے۔

تلخیص وتجزیہ کی عبارت کافی صاف وشگفتہ ہے، لیکن موضوع اس سے زیادہ سلاست وروانی چاہتا تھا کتاب مطالعہ کے قابل ہے اور ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن نے اس کی اشاعت کرکے واقعی زبان کی خدمت انجام دی ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنے۔

محسوسات ماہر جناب ماہر القادری کے کلام کے پہلے مجموعہ کا دوسرا اڈیشن ہے اس میں ۵۸ نظمیں اور ۵۶ غزلیں ہیں۔ غزلوں کی ترتیب میں یہ جدت کی گئی ہے کہ ہر غزل کا ایک عنوان مقرر کردیا ہے، حالانکہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مستقل چیز ہوتا ہے۔ چونکہ اس مجموعہ میں ماہر القادری کے ابتدائی مشق کی چیزیں بھی بہت سی شامل ہیں، اس لئے اغلاط سے خالی نہیں تاہم ان کے مطالعہ سے شاعر کے درخشاں مستقبل کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ کاغذ اور کتابت وطباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ خاصہ کی چیز ہے۔

قیمت دو روپیہ بارہ آنے اور ملنے کا پتہ ادارۂ اشاعت اُردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

نغمات ماہر جناب ماہر القادری کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے اور یقیناً پہلے مجموعہ سے بہتر ہے۔ اس مجموعہ کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے چند سال میں کتنی نمایاں ترقی حاصل کرلی۔ اس مجموعہ کی نظموں اور غزلوں میں نہ صرف پختگی وروانی پائی جاتی ہے بلکہ مفہوم کے لحاظ سے بھی کافی بلند ہیں۔

قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن۔

کہکشاں جناب محمودہ رضویہ کے ادبی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے کئی مجموعے اور بھی شایع ہوچکے ہیں اور ان سب میں اتنی یکرنگی پائی جاتی ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ فاضل خاتون کے لٹریچر نے کیا اور کس طرح ترقی کی، یہ مقالے ہرچند صرف خیال پرستی کی پیداوار ہیں، لیکن چونکہ عورت کا کوئی خیال رنگینی سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے یقیناً بہت دلکش ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو کراچی۔

کلیات حسرت موہانی اس سے قبل کلام حسرت کئی حصوں میں علٰحدہ علٰحدہ شایع ہوا تھا اور اسکی یکجائی شیرازہ بندی دشوار تھی۔ اب یہ حصے ایک ساتھ شایع کئے گئے ہیں اور اس طرح

ان کا پورا کلام بین الدفتین ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اس کی قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ دفتر اردوئے معلّٰی۔ کانپور

انتخاب غالب

نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور کو شاعری سے بڑا شغف تھا اور اس سلسلہ میں جب انھوں نے اساتذۂ اُردو و فارسی کے منتخب اشعار کی ایک بیاض ترتیب کرنے کا عزم کیا تو غالب کو بھی تحریر کیا گیا کہ وہ اپنے اُردو فارسی کلام کا انتخاب بھیجدیں۔ یہ ۲۵ر اگست ۱۸۶۶ء کی بات ہے۔

غالب نے اس تحریر کی تعمیل میں ۲۸ر ستمبر کو دیوان اُردو، اور ۲۴ر ستمبر کو دیوان فارسی کا انتخاب بھیجدیا۔ جو کتب خانۂ رامپور میں محفوظ ہے چونکہ اس انتخاب کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اس لئے مولانا عرشی ناظم کتاب خانہ رامپور نے جو اس سے قبل مکاتیب غالب شایع کرچکے ہیں، اس کی اشاعت کو بھی ضروری سمجھا اور موجودہ فرمانروائے رامپور کو اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔

مکاتیب غالب جس شان کے ساتھ شایع ہوئی اس کے متعلق اہل نظر کا خیال تھا کہ ٹائپ کی طباعت اور دوسری خوش نمائیوں کے لحاظ سے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن انتخاب غالب کی اشاعت حُسن نے اسے بھی بھلا دیا۔

نہایت دبیز کاغذ پر سفید حاشیہ چھوڑکر کاسنی رنگ کے حوض میں جو آب رواں کی جھلک پیدا کر رہا ہے، یہ انتخاب روشن سیاہی سے نہایت خوبصورت ٹائپ میں چھاپا گیا ہے جس کا ایک ایک حرف ایک بہترین نقش کی طرح آنکھوں میں کھبا جاتا ہے۔

ابتدا میں جناب بشیر حسین صاحب زیدی چیف منسٹر رامپور کی لکھی ہوئی تقریب ہے، اور اس کے بعد مولانا عرشی کا دیباچہ جس میں انھوں نے غالب کے فارسی ذوق شعری پر گفتگو کرتے ہوئے اس مجموعہ کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غالب نے اپنے کلام کا جو انتخاب کیا ہے وہ بڑی حد تک سرسری ہے لیکن اسکی تاریخی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔

اخیر میں شرح غالب کے عنوان سے جو ضمیمہ عرشی صاحب نے شامل کیا ہے وہ بڑے کام کی چیز ہے کیونکہ اس میں بہت سے اشعار کا مفہوم خود غالب ہی کی تحریروں سے متعین کیا گیا ہے۔

ملک کو جناب عرشی کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کی محنت و وساطت سے یہ نادر چیز ملک کے سامنے آگئی اسکی قیمت غالباً دس روپیہ ہے، جو اس کی تمام خوبیوں کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں ہے۔

ریاض فردوس

دیوان ہے شاہ عبدالمجید مضطر، مظفرپوری کا۔ ابتدا میں سید سلیمان ندوی کا تعارف نامہ ہے، اس کے بعد عبدالسلام صاحب ندوی کا مقدمہ اور پھر دو تقریظیں جن میں ایک وحشت کلکتوی کی ہے۔ ان تمام حضرات نے مضطر صاحب کو سراہا ہے۔

مضطر صاحب، آرزو لکھنوی کے شاگرد ہیں اور قدیم رنگ کے متبع۔ کلام میں گو کوئی خاص بات نہیں لیکن صاف ضرور ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ: جناب مضطر مظفرپوری ناظم مدرسۂ جامع العلوم مظفرپور

عبدالماجد دریابادی سینماہال میں!

معشوق ہزار شیوہ کی نئی عشوہ گری!!

(مدیر مدینہ کے قلم سے)

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام نامی سے غالباً آپ ناواقف نہ ہوں گے۔ آپ بھی بڑی شان کے بزرگ ہیں۔ تاریخ ایسی شخصیتیں بہت کم پیدا کرتی ہے، اور جب پیدا کر دیتی ہے تو پھر صدیوں اُن پر ناز کرتی ہے۔ ایران کے حسن بن صباح اور روس کے راسپوٹین اپنی وضع کے نرالے تھے۔ دونوں کے عمل کے دائرے ایک دوسرے سے دور تھے۔ بالکل متضاد۔ مگر تاریخ میں دونوں کی جگہ پاس پاس ہے۔ ہمارے مولانا عبدالماجد کا میدانِ عمل بھی ان دونوں سے جُدا ہے۔ قطبین کی طرح جُدا۔ مگر انوکھے پن میں ان سے زیادہ دور نہیں۔ غلط فہمی نہ ہو، مولانا کے کردار کا ناواجب استخفاف مقصود نہیں تمثیل صرف انوکھے پن میں ہے اور کسی چیز میں نہیں۔ لیکن بایں ہمہ ہمیں مولانا سے عقیدت ہے۔ وہ معشوق ہزار شیوہ ہیں ایک رنگ سے دیر تک مانوس نہیں رہ سکتے۔ ہر بار ایک نیا رنگ ہر مرتبہ ایک نیا روپ — چنانچہ آپ کی تازہ عشوہ گری یہ ہے کہ — آپ سینما میں "چورنگی" کا تماشا دیکھنے پہونچے۔ کیسے پہونچے۔ اس کا اندازہ خود انھیں کی زبان سے سنئے۔ ہم ان کی پوری عبارت من وعن نیچے نقل کرتے ہیں۔ پڑھئے اور پڑھتے وقت مولانا کی شخصیت کو سامنے رکھئے — یعنی نام خدا پچاس کے لگ بھگ سن وسال، پارسایانہ جبہ وقبہ، درویشانہ کلاہ، لمبی داڑھی، جس کے بالوں میں سفیدی غالب، چہرہ پر تقدس کا رنگ طاری، تول تول کر بولتے ہیں۔ سوچ سمجھ کے مسکراتے ہیں اور ہولے ہولے چلتے ہیں، ہر وقت قرآن وحدیث کا تذکرہ، عوام کی جہالت پر تبصرہ، انگریزی پڑھنے والوں پر مضحکہ، تہذیب جدید پر خندہ وقہقہہ، کالجوں اور یونیورسٹیوں پر طنز وطعنہ خصوصاً عورتوں کی تعلیم اور تجدد پسندی کے خلاف صدائے بیباکانہ — غرض وہ سب کچھ جو ایک درویش صفت مولوی یا ایک مولوی صفت درویش کی ظاہری وضع قطع میں آپ کو نظر آسکتا ہے۔ پھر سنئے کہ یہ درویش کیا فرماتا ہے۔

مولانا نے یہ مضمون اپنے اخبار کے ایک مستقل عنوان "سچی باتیں" کے تحت لکھا ہے۔ لیکن ہماری رائے میں اس کا عنوان ہونا چاہئے تھا:

جبر ہے، قہر ہے، قیامت ہے　　دل جو بے اختیار ہوتا ہے

اچھا سنئے: ارشاد ہوتا ہے — "حال کا ذکر ہے، ایک روز لکھنؤ میں ایک سینما فلم کو دیکھنے گیا۔ جی ہاں سینما فلم کو! — کبھی کبھی لمبے وقفوں کے بعد اس فسق کا ارتکاب عمداً کر لیا کرتا ہوں اور اللہ سے امید یہ لگائے رکھتا ہوں کہ میری نیت پر نظر کرکے اس باب میں مواخذہ نہ فرمائے گا۔ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ شیطانی ترقیاں سال دو سال میں کہاں سے کہاں پہونچیں! — سینما ہال میں داخل ہونا تھا کہ خود مرکز نظر بن گیا۔ گردنیں ہلیں، سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ ایک آواز آئی "ارے ہاں انھیں جانتے ہو، یہی مولانا، جو ابھی آکر بیٹھے ہیں؟" دوسرے بولے، "یہ تو وہ ہیں، دریابادی صدق والے"، تیسری آواز آئی "یہ ان کے آنے کی بھی خوب رہی!" مناسب یہی معلوم ہوا کہ یہ ساری سُنی ان سُنی کر دیجائے، ورنہ عجب نہ تھا کہ تماشائی خود ہی تماشا بن جاتا! تماشے کا نام تھا "چورنگی"، کلکتہ کے ایک مشہور مرکزی چوراہے کے نام پر طیار کیا ہوا ایک مسلمان کمپنی کا۔

سینما کے تماشوں میں اور ہوتا ہی کیا ہے؟ وہی گانا، وہی بجانا، وہی ناچ، وہی مرد وعورت کا اختلاط، وہی گھٹے چہرے اور

ننگے بازو۔ البتہ اُردو پر ذرا کرم رہا کلام بجائے کسی ایسے ویسے کے غالب و جگر کا گایا گیا مشاعرے کے منظر میں بھی جگر ہی کو نمایاں کیا گیا۔ درمیان میں الہ آباد کے ایک ہندو شاعر لائے گئے۔ وہ بھی مہذب، شایستہ، نستعلیق، گویا ایک پرانی اور بھولی ہوئی اصطلاح ہیں "مطبع الاسلام" زبان کا معیار خاصہ بلند! مکالمے بہت غنیمت رہے، ان ادبی پہلوؤں سے قطع نظر، بُرائی انگریزی ناچ کی، اور "صاحبانہ" زندگی کی دکھائی گئی! تماشے کے خاتمے پر اثر دل پر یہ پڑتا ہے کہ فرنگی معاشرت کوئی چیز کشش اور رغبت کی نہیں، بچنے اور دور رہنے کے قابل ہے۔ اتنا سبق بھی اگر سینما کے پردہ سے حاصل ہو جائے تو وہ بہت کچھ ہے۔ خدا سے قریب نہ سہی، شیطان اور شیطنت سے بُعد بھی تو ایک نعمت ہے۔ اور یہی ایک سبق اگر شیطان کی تماشا گاہ سے ملجائے تو بہت ہے۔ لیکن نہیں۔ اس تماشہ میں تو اس سے بھی زاید کچھ تھا۔ آخر کے منظر میں ایک کھلی ہوئی نعتیہ غزل اور اس سے بھی بڑھ کر پردہ پر معجزۂ شق القمر کی تصویر، عوام کے حق میں بڑی گہری تبلیغی قیمت رکھتی ہے — تماشہ گر، شیطان کے کھیل میں بھی خدا و سول کو نہ بھولا رند بد مست ہو کر گرا بھی، تو سر ساقی ہی کے قدموں پر رہا!

اچھا کہنے والوں میں اس وقت ایک فضلی صاحب بھی ہیں۔ ان کی کتاب "نغمۂ زندگی" میں ایک بڑی سی نظم ہے "فلم کا جادو" ان کا کہنا یہ ہے کہ جب یہ بلا پھیل چکی اور عالمگیر طور پر مسلط ہو چکی ہے تو کیوں نہ اُس کو اپنا لیا جائے۔ اور کیوں نہ انقلاب ملی کا آلۂ کار اسی کو بنا لیا جائے؟ خیر اُن کا یہ فلسفہ تو بجائے خود ایک شاعری ہے۔ البتہ ان کے شروع کے یہ دو شعر شاعری کے نہیں حقیقت کے ترجمان ہیں ؎

قیامت فلم کی جادوگری ہے　　یہ عہد نو کا سحر سامری ہے
اثر ہے اس میں اخباروں سے بڑھکر　　ہے اس کی کاٹ تلواروں سے بڑھکر

قابل داد ہیں وہ جو سحر سامری کو کسی درجہ میں اعجاز موسوی کے تابع کر دیں، اور فسق سے بھی کچھ نہ کچھ کام اصلاح و تبلیغ کا لے مریں!۔۔ غلط فہمی نہ ہو، سینما بازی اور فلم سازی کی حوصلہ افزائی ہرگز مقصود نہیں۔ جو چیز حرام ہے وہ بہر صورت حرام ہی رہے گی۔ مقصد صرف اسقدر ہے کہ جن کو بدقسمتی سے ان مشغلوں اور پیشوں کی طرف جانا ہی ہے، وہ بھی اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ مستی میں بھی ہوش و حواس قایم رکھیں اور شیطان پر لاحول شیطان ہی کی زبان سے پڑھوا چھوڑیں۔ عجب کیا کہ "ان الحسنات یذھبن السیئات" کا قانون نافذ کرنے والا حاکم انبار معصیت سے نیکی کے یہی چند دانے چُن لے! یوں بھی قانون کی خلاف ورزی کے وقت قانون کا احترام تھوڑا بہت قایم رکھنا جرم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ نفس کی خرمستیاں جب انسان کو منھ کالا کرنے پر آمادہ ہی کر دیں تو صریح حرامکاری کے مقابلہ میں تو متعہ کی گنجایش بہر حال ہے۔ اگر اجازت ہو تو اس پر اتنا اضافہ ہماری طرف سے اور کر — جب متعہ اور متعہ نہ ہو تو طلاق کی گنجایش موجود ہے تو پھر حرام کاری کا سوال ہی کیوں پیدا ہو، اور اگر نیک نیتی کا پردہ موجود ہے تو پھر نفس کی خرمستیاں منھ کالا کرنے پر مجبور ہی کیوں کریں۔ — !

بُت خانے کو اُس بُت کے جھمکے سے ہماری خدائی　　تو ہو تو بھلا طوف حرم کون کرے پھر؟

بہر حال عبارت آپ نے پڑھ لی۔ انشا کی زبان میں اس کا ماحصل صرف یہ ہے:

یہی لطف ہے ساقیا مے کشی کا　　کہ تو بھی بہک اور ہم کو بھی بہکا

لیکن ہم اس پر کچھ تبصرہ کرنا نہیں چاہتے اس لئے کہ ہم جیسے سراپا عصیاں کو مولانا جیسی شخصیت کی نسبت کچھ کہنے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔ ہم تو یہی سمجھے کہ یہ بھی کوئی ادائے درویشانہ ہے۔ ہم خاک اُفتادہ عامی بھلا ان اسرار کو کیا سمجھیں۔ وہ جو دنیا کی آلودگیوں میں آلودہ اور معصیت کی وادیوں میں آوارہ ہے، ایک جبہ و دستار کے مالک کی طرف انگشت اعتراض کیسے اُٹھا سکتا ہے۔ اس دنیا کی ریت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ یہاں ظاہر کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ کون دیکھتا ہے کہ جبہ و دستار کے نیچے دشنہ ہائے تیز نہاں ہیں یا ید بیضائے موسوی — مگر جب ہندوستان کے ایک مستند عالم یعنی مولانا منظور احمد نعمانی (مدیر الفرقان) نے دریابادی سے گہرا تعلق خاطر رکھنے کے باوجود مذکورۂ بالا دلائل و براہین کی شرعی و اسلامی حیثیت واضح کی تو کچھ ہماری بھی ہمت بندھی۔

البتہ مولانائے دریابادی کا تھوڑا سا تعارف کرا دینے کا فرض ہم انجام دئے دیتے ہیں تاکہ آپ چیزوں کو صحیح پس منظر میں دیکھ سکیں۔

تعارف | نوجوانی کا عالم ہے۔ کالج سے بی اے کی ڈگری لیکر نکلے ہیں۔ "مولانا" کے لفظ کا مذاق اُڑاتے ہیں اور "مسٹر" عبدالماجد کہلاتے ہیں۔ چونکہ اُس زمانہ میں مسلمانوں میں انگریزی تعلیم بہت کم تھی اس لئے بی اے پاس کرلینا بڑی سندِ فضیلت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ "مسٹر عبدالماجد" کا شمار بھی ملک کے "مایۂ ناز" فاضلوں میں ہوا۔ آپ نے رسالوں میں مضمون لکھے اور گو وہ انگریزی مصنفوں کے خیالات کا چربہ تھے مگر انداز بیان ایسا رکھا گیا گویا "مسٹر عبدالماجد" کے ذاتی خیالات ہیں یہ مضمون "فلسفیانہ" کہلاتے تھے اس لئے کہ ان میں مذہب، روحانیت اور خدا و رسول پر کھلی نکتہ چینی ہوتی تھی اور آجکل کے اس فیشن سے آپ واقف ہی ہوں گے کہ کالج میں جو لڑکا ذہین سمجھا جاتا ہے وہ اپنی ذہانت کا اعلیٰ معیار ہمیشہ مذہب کے خلاف لب کشائی کرنے کا تصور کرتا ہے۔ آپ مذہب کے خلاف جتنے سخت ہوں گے اُتنے ہی روشن خیال اور آزادی پسند سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ ہمارا زیرِ تذکرہ "ہیرو" بھی اتنا آزادی پسند اور روشن خیال تھا کہ بنی کریم کو نپولین بوناپارٹ، روسو اور والیٹر وغیرہ کی قسم کا ایک مصلح قوم یعنی ریفارمر سمجھتا تھا۔ آپ پیغمبر کے روحانی تصور کے قایل نہ تھے۔ لیکن چند دن کے بعد اس رنگ سے طبیعت اُکتا گئی۔ سامنے نظر اُٹھائی تو تحریک خلافت کا ہنگامہ نظر پڑا۔ فوراً جھنڈا لیکر اُس میں شریک ہوگئے۔ یہ تحریک ختم ہوئی تو کانگریس کی دلکشی نے دامنِ دل کو کھینچا۔ اسی دوران میں کچھ دوستوں اور بزرگوں کی مدد سے حیدرآباد سے کچھ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ اس طرح فکرِ معاش سے نجات ملنے پر طبیعت نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ زندگی کے اس پرسکون بہاؤ نے گوشہ گیر ہوکر مقتدی سے مقتدا بننے کا رجحان پیدا کیا "سچ" کے نام سے ایک اخبار نکالا جو پوری قوت سے کانگریس کی حمایت کرتا تھا۔ مگر اب پھر طبیعت نے پلٹا کھایا۔ مولانا ظفر الملک علوی "سچ" میں آپ کے رفیقِ عمل تھے۔ مگر بدنصیبی سے وہ ایک "نباتِ بے جان" کی طرح اپنے اُصول کے پکے تھے اس لئے ہمارے سراپا "حرکت و زندگی" ہیرو سے بھلا کیسے نبھ سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ اختلافات بڑھے اور بالآخر نوبت "ترکِ موالات" تک پہونچ گئی۔ قانونی حیثیت سے "سچ" کے ذمہ دار ظفر الملک صاحب تھے۔ اس لئے ہمارے مولانا کو بے دخل ہونا پڑا۔ اور اب "سچ" کے بجائے "صدق" کا اعلان ہوا۔

اسی اثنا میں صوفی و درویشی کا منظر طبیعت کو بہت بھایا۔ چنانچہ خانقاہوں کی مجالسِ حال و قال میں پاکوبی کرتے نظر آنے لگے۔

دست افشاں پاکوباں شوق میں صومعے سے میرِ حی باہر گئے!

اسی دوران میں سیاسی نظریہ بھی انقلاب طبیعت کی نذر ہوا۔ پہلے ارشاد ہوتا تھا کہ دین و سیاست ایک ہیں اس لئے علماء ہی کو حقیقی اہلِ سیاست سمجھنا چاہئے۔ مگر اب استعارہ و کنائے کی زبان میں یہ اشارے ہونے لگے کہ سیاست علماء کا حق نہیں۔ تم دین کی باتوں میں لگے رہو اور سیاست جو دنیا کی چیز ہے وہ تو کچھ انگریزی خواں طبقہ ہی کو زیب دیتی ہے۔ پھر ایک دوسری لہر اُٹھی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے قایل ہوئے۔ بڑے لمبے لمبے تعریفی شذروں کے ساتھ ان کے مضمون شایع ہوتے رہے۔ اسلام کی امامت و رہبری کی دستار اُن کے زیبِ سر کی گئی۔ مگر پھر ایک صبح جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مودودی صاحب پر، اُن کے ہمنواؤں پر، اُن کی تحریک پر اور اُن کی ہر ہر چیز پر برہم ہو رہے ہیں اور دنیا کے تمام عیوب اُن کی ذات سے وابستہ ہیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

زورِ طبیعت | مولانا کا زورِ طبیعت عموماً کسی پر طنز و استہزا کرنے اور اپنے حریف کی عیب جوئی کرنے میں بہت کامیابی سے نمایاں ہوتا ہے چنانچہ جب تک روشن خیالی کا دورہ رہا طبیعت کا یہ جذبہ مذہبیت کے خلاف صرف ہوتا رہا پھر جب رنگ بدلا تو اپنے ہر فعل کے جواز میں مذہب کی سند پیش کی جانے لگی۔ چند سال ہوئے جب آپ نے اپنے ایک دوست کی بیوہ سے عقدِ ثانی فرمایا کر چند دنوں بعد بلا کسی معقول سبب کے طلاق دی۔ اور اُس پر قدرتاً ہر طرف سے باز پرس کی گئی تو آپ نے ثابت کیا کہ یہ فعل عین اسلام تھا! اور معاذ اللہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حیاتِ پاک سے مثالیں پیش کرکے اپنے فعل کی ذمہ داری دامنِ رسالت سے باندھ دی گئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج جبکہ ہماری معاشرت کا بیشتر گوشہ عہدِ سعادت کے سراسر خلاف ہوچکا ہے اور قدیم ہندو ذہنیت اور غیر اسلامی ماحول کے اثر نے ہمارے آداب بود و ماند میں شیر و

بطحیٰ کی سی سادگی باقی نہیں رہنے دی ہے تو ہمیں اپنے افعال کو اُس دورِ مبارک سے نسبت دیتے وقت بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے ورنہ سوئے ادب بلکہ گمراہی کا احتمال یقینی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج جب ہم نے عورت سے خودداری اور خود اعتمادی کا ہر وہ استحقاق چھین لیا ہے جو نبی کریم کے زمانے میں اُسے حاصل تھا اور ہمارے رسم و رواج نے ہندو مت کی تقلید میں عورت کو صرف مرد کی عیاشی و فحاشی کا بازیچہ بنا کر اُس کی معاشرتی حیثیت کو پستی و پسماندگی کے عمیق ترین غار میں لا ڈالا ہے تو بلاشبہ طلاق کے مسئلے میں عہد رسالت کی مثال پیش کرنا سوئے ادب ہی نہیں، تحریفِ واقعات بھی ہے۔

بدنصیبی سے آج پھر اسی قسم کے تحریفِ واقعات کا اعادہ ہو رہا ہے۔ مولانا سینما جاتے ہیں اور فحاشی و معصیت کے تمام عریاں مناظر دیکھتے ہیں۔ لیکن "حسنِ نیت" کا پردہ ڈال کر اسے "عینِ اسلام" قرار دیدیتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام کی تفسیر میں ذوالقرنین کے مجسمے کا ایک خالص تاریخی فوٹو آپ کو "حسنِ نیت" کے حسنِ ظن کی طرف رہبری نہیں کرتا اور آپ مولانا آزاد پر بے تحاشہ برس پڑتے ہیں۔ "تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی" کے خیالات میں بھی آپ کو "حسنِ نیت" کا پہلو نہیں نظر آتا اور طنز و استہزا کا پورا زورِ قلم اُسکے خلاف صرف کر دیا جاتا ہے۔ دو مسلمان لڑکیاں، پردۂ فلم پر ایکٹری کا شغل اختیار کر لیتی ہیں تو اس میں بھی آپ کو حسنِ نیت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا اور آپ اتنے چراغ پا ہوتے ہیں کہ اُن کے والدین کو ملازمت سے برطرف کرا دینا چاہتے ہیں — لیکن ٹھیک اُسی وقت جبکہ اس احتجاج کی سیاہی بھی خشک ہونے نہیں پاتی، بڑے شان سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ ہم خود سینما دیکھنے گئے اور پہلی ہی بار نہیں گئے، بلکہ بار بار جاتے رہتے ہیں سبحان اللہ — ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند — مولانا نصراللہ خاں مدیر مسلمان (لاہور) نے خوب لکھا ہے کہ یہ بھی خوب رہی کہ عورتوں کے لئے جو اخلاق ہے وہ مردوں کے لئے نہیں۔ مرد ایکٹر بنیں تو کچھ نہیں، سینما دیکھیں تو نیت کی خوبی کی وجہ سے صاف گرفت سے بچ جائیں لیکن عورتیں اگر یہی جُرم کریں تو بخشش کے سارے دروازے بند نظر آئیں۔

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے — یونہی اگر تو چاہے تو بندے کی کیا چلے

سینما اور پروپیگنڈا مولانا کے سحر نگار قلم نے پردۂ فلم کے سحر سامری ہونے کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس کے جواز کی سند کی طرح صرف نفس کا فریب ہے یا نفس پُر فریب کا جادو ہے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اصل چیز دیکھنے والی آنکھ ہے لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھو تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ نہیں۔ ہندوستان میں سنما کو الحمدللہ کہ اب بھی ثقہ لوگ بہت کم دیکھتے ہیں۔ عموماً پست طبقے کے نچلے لوگ یا کالج کے نوجوان لڑکے اس میں ہوتے ہیں پھر اثر اس سے کوئی بھی نہیں لیتا اور اثر لے بھی کیا۔ ہندوستانی فلموں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ سوائے عریاں قسم کے ناچ گانے کے۔ انگریزی اور وہ بھی امریکہ کے فلم البتہ فنِ ادب کا ایک جزو ہو سکتے ہیں اور وہ ضرور کسی نہ کسی حد تک خیالات میں تبدیلی کر سکتے ہیں مگر ہندوستانی فلموں میں کیا دھرا ہے یہاں تو صرف یہ ہے کہ جب طبیعت ذرا گھبرائی، ٹکٹ لیا برہنہ صورتیں دیکھیں آہ واہ کیا اور اُس کے بعد عیاشی و فحاشی سے ابلیسی جذبات کو تسکین دے لی کالج کے نوجوان طلباء نے زیادہ "ادبیت" دکھائی تو حسین و جمیل ایکٹریسوں کا البم تیار کر کے رکھ لیا۔ ان کے کیلنڈر خرید کر کمرے میں آویزاں کر لئے۔ اس سے بھی زیادہ شوق نے مہمیز دی تو کسی ایکٹریس کو دو چار خطوط لکھ دئے کہ ہائے بتِ کافر تیرے عشق میں جان جاتی ہے وغیرہا من الخرافات — بس یہ ہے اُس سحر سامری کی ساری حقیقت جس پر ہمارے مولانا اتنے ریجھے ہوئے ہیں۔ دوسری بات ہے کہ ان پر بھی کسی "بُت بے پیر" کا جادوئے حُسن چل گیا ہو۔ اور بات بھی یہ ہے کہ

برقع کو اُٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے!

تیر مرحوم بھی کیا خوب کہہ گیا ہے:

کیا کیا دعائیں مانگے ہیں جلوت میں شیخ جی — ظاہر جہاں سے ہاتھ اُٹھایا تو کیا ہوا

یہ خاکسار مولانا کی طرح صوفی و درویش ہونے کا مدعی نہیں۔ ایک بندۂ گنہگار ہے۔ اور بخشش کے لئے کسی حیلۂ شرعی کے بجائے صرف خدا کی رحمت پر آس لگائے بیٹھا ہے۔ مگر نوجوانی کے زمانے میں سنما کا جو شوق تھا آج اُس کا تصور کرتے ہوئے بھی حیرت ہوتی ہے۔ نادانی کے اُس

دور میں بلاشبہ ہر طرف فلم ہی فلم کی فضا نظر آتی تھی اور یہ فقرہ زبان پر جاری تھا کہ لیڈر کچھ انقلاب کر سکتے ہیں نہ اڈیٹر نہ شاعر نہ ملّا نہ صوفی، اگر کچھ انقلاب کر سکتے ہیں تو صرف ایکٹر اور ایکٹرسیں لیکن اب اس تصویر پر مٹی آتی ہے۔ دس بارہ سال سے کبھی سنما جانے کا تصور بھی نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ صنعت ہماری زندگی پر کوئی اثر ہی نہیں رکھتی، رہ گیا حسن صورت کا سوال سو اس باب میں بھی راقم الحروف نبی اکرم کے اُس کلام فیض ترجمان کے فلسفہ کا روز بروز قایل ہوتا چلا جاتا ہے کہ جب نفس کسی مقام پر ابلیسی کشش محسوس کرے تو اپنے گھروں کی طرف رجوع کرو کہ جو چیز تمھیں معصیت کی طرف للچا رہی ہے وہ دراصل خود تمھارے دامن میں موجود ہے۔

پس مولانا اگر غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ کم از کم موجودہ زمانہ میں تو ہندوستانی فلم کی حیثیت ایک تماشے سے زیادہ نہیں جس میں پست طبقے کے نچلے لوگوں اور اوباشوں کے علاوہ کالج کے نوجوانوں کا عنصر نظر آتا ہے یا پھر وہ لوگ ہیں جو اس دورِ سرمایہ داری کے قارون ہیں اور نہیں جانتے کہ اس سرمائے کو کہاں خرچ کریں۔ وہ سنجیدہ و متین طبقہ جو رائے عامہ پر اثر انداز ہے الحمدللہ کہ اب بھی بہت کم سنما جاتا ہے اور اگر جاتا بھی ہے تو وہاں سے صرف تماشہ دیکھ کر آتا ہے زندگی کا کوئی فلسفہ لیکر نہیں آتا۔ خواہ وہ حسن نیت ہی کا فلسفہ کیوں نہ ہو۔ انگریزی فلموں کی نوعیت البتہ اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ مگر یہاں تو سوال "چورنگی" کی قسم کے اُن فلموں کا ہے جسے دیکھ کر ہمارے دریابادی صاحب ایسے آپے سے باہر ہوئے کہ بدمستی کے عالم میں منبر پر کھڑے ہو کر مے و شیشہ کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ بھی پڑھ ڈالا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ قلم اینجا رسید و سر بشکست!!

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

معذرت | آخر میں اتنا عرض کر دیں کہ مولانائے دریابادی کی طرح ہمارا مسلک یہ ہرگز نہیں کہ کسی کی پگڑی اُچھالیں۔ اب صرف ایک وجہ سے مجبوراً یہ سطور قلمبند کرنی پڑیں اور وہ یہ کہ مولانا کی ظاہری مذہبیت کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ کہیں عوام ایک نئے فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

اتفاق سے آج کل مولانا انگریزی میں قرآن شریف کا ترجمہ بھی کر رہے ہیں اس لئے لوگوں پر آپ کے تقدس کا اور زیادہ اثر ہے۔ ایسی صورت میں جب "کھلے چہرے اور ننگے بازوؤں" کے ترانے کی گونج لوگوں نے سنی تو گوشے گوشے سے مطالبہ ہوا کہ —

مستی سے اُس نگاہ کی اے محتسب خبر — دُنیا تمام بزم خرابات ہو گئی

بنابریں سخت ضرورت ہوئی کہ ایک اُٹھتی ہوئی غلط فہمی کو ابتدا ہی میں عالم آشکار کر کے دبا دیا جائے۔

(نگار) جناب عبدالماجد دریابادی کی یہ حرکت، جس پر مدیر مدینہ نے اتنا زبردست احتساب کیا ہے، مذہبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے بُری ہو یا اچھی، ہمیں اس سے بحث نہیں، کیونکہ عبدالماجد صاحب صوفی بھی ہیں اور اگر انھوں نے اس الزام کے جواب میں یہ کہدیا کہ

میان کعبہ و بتخانہ راہے ست

تو کوئی کیا کر سکتا ہے، لیکن مدیر مدینہ سے ہم کو (عبدالماجد صاحب کی طرف سے نہیں، اپنی طرف سے) یہ شکایت ضرور ہے کہ انھوں نے معاملہ کے دوسرے پہلو کو جو واقعی قابل داد ہے، بالکل نظر انداز کر دیا ——— یعنی ——— کیا اس کا امکان نہیں کہ عبدالماجد صاحب نے یہ سب کچھ ایک مسلم فلمساز کمپنی (فضلی برادرس) اور اس کی تصویر "چورنگی" کے پروپاگنڈا کے لئے کیا ہو ——— اور ——— اگر یہ صحیح ہے (جس کی ہمیں عبدالماجد صاحب کی ذہانت سے بڑی توقع ہے) تو کیا اس سے بہتر طریقہ وہ کوئی اختیار کر سکتے تھے کہ وہی چیز جس کا نام لینا بھی اہل مذہب کے نزدیک گناہ تھا، اب اس کا ذکر بار بار اُن کے صحایف میں نظر آ رہا ہے۔

دنیا کچھ کہے، لیکن ہم عبدالماجد صاحب کے اس "شیوۂ کار آگہی" کی داد ضرور دیں گے۔

پاک ست خرقۂ کہ بہ مے شست و شو کنند!

(بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۲) — تیونسیا کی فتح کے بعد جزایر سسلی اور سارڈینیا پر جس تیزی و قوت کے ساتھ ہوائی حملے ہو رہے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جزیرے بھی بہت جلد اتحادی قبضہ میں آجائیں گے اور بحر روم محوری اثر سے بالکل پاک ہو جائے گا۔ اس کے بعد کھلا ہوا نقشہ یہی ہے کہ اٹلی کے ساحلوں پر چڑھائی کی جائے اور یوروپین محاذ جنگ کی ابتدا اسی طرح ہو گی

ہو سکتا ہے کہ سواحل اطالیہ پر حملہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ناروے، بلجیم، یونان و فرانس کے ساحلوں پر بھی اقدام شروع کیا جائے تاکہ ہٹلر کی قوت مختلف مقامات پر بٹ جائے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اقدامات زیادہ تر ہوائی حملوں سے متعلق ہوں گے

اتحادیوں کی فضائی قوت اس وقت بہت بڑھی ہوئی ہے اور برابر اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اس لئے اگر انھوں نے یوروپ کے ساحلوں پر اپنی فوجیں فی الحال نہ اتاریں، تو بھی وہ دشمن کے استحکامات کو کافی نقصان پہونچا سکتے ہیں اور یہی وہ تمام تلخ حقیقتیں ہیں، جنھوں نے محوری طاقتوں اور خصوصیت کے ساتھ مسولینی کو سراسیمہ بنا رکھا ہے

اس سلسلہ میں یہ سوال بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ جرمنی و اطالیہ کی شکست کا اثر جاپان پر کیا ہوگا، یعنی کیا اس کا امکان ہے کہ وہ ہٹلر مسولینی کی ناکامیوں سے متاثر ہو کر بغیر جنگ کئے ہوئے اتحادیوں سے صلح کر لے، ہم سمجھتے ہیں کہ بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ جاپان کا مسئلہ باوجود اس کے کہ وہ محوری مرکز سے وابستہ ہے، محوری شکست و فتح سے بہت کم تعلق رکھتا ہے۔ بحر الکاہل میں جتنے جزایر پر اس کا قبضہ ہو چکا ہے، وہ اسکے حوصلہ کے لحاظ سے کم نہیں ہے اس لئے وہ حملہ تو اب کسی طرف نہ کرے گا، لیکن جو کچھ اسے مل چکا ہے، اسے وہ آخر دم تک نہ چھوڑے گا۔ اس لئے یوروپ کی جنگ کے بعد ایشیا میں بھی ایک جنگ ہونا ضروری ہے اور یہی وہ وقت ہوگا جب ایک طرف برطانیہ و ہندوستان اور دوسری طرف جاپان و روس کے آیندہ تعلقات پوری روشنی میں آئیں گے

اس دوران میں جب جاپان پر حملہ کرنے کی خبریں آرہی تھیں تو یہ بھی سننے میں آتا تھا کہ سائبیریا کی طرف روس کے بعض بحری و فضائی اڈے عارضیاً حاصل کئے جائیں گے، لیکن اس کی تکمیل کا فی الحال کوئی امکان نہیں، کیونکہ روس و جاپان کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف اقدام نہ کرنے کا معاہدہ ہو چکا ہے اور جب تک ہٹلر کا سطرہ دور نہ ہو جائے جاپان سے بگاڑنا روس کے مصالح کے خلاف ہے۔ اب رہا آسٹریلیا، برما اور بحر ہند کی طرف سے حملہ کرنا، سو اس میں اسوقت کامیابی ہو سکتی ہے، جب یوروپ کی طرف سے فارغ ہو کر، تمام بری، بحری و فضائی قوت کو اس طرف لے آیا جائے۔ اور اس کے لئے ابھی کافی وقت درکار ہے

چین کی حالت اس میں شک نہیں بہت نازک ہوتی جا رہی ہے اور عجب نہیں کہ بحر الکاہل کی آیندہ جنگ شروع ہونے تک جاپان، چین کے تمام اُن اہم علاقوں پر قابض ہو جائے جو جنگ کے جاری رکھنے اور اتحادیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ برما اور برما کی سڑک کا ہاتھ سے نکل جانا، درحقیقت انگریزوں کی شکست نہیں، بلکہ چینیوں کی شکست ہے، کیونکہ اب اتحادیوں کے پاس کوئی اچھا ذریعہ چین کو مدد پہونچانے کا باقی نہیں رہا اور چین برسوں تک لڑائی جاری رکھنے کے بعد اب اس قدر تھک گیا ہے کہ مشکل ہی سے اپنی آزادی و خود داری کو زیادہ عرصہ تک قایم رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے

الغرض حالات، باوجود امید افزا ہونے کے بھی تشویش سے خالی نہیں ہیں، اور ابھی دُنیا برسوں تک اس مصیبت سے نجات پاتی ہوئی نظر نہیں آتی، کیونکہ اگر تمام واقعات امید کے مطابق ظاہر ہوتے رہیں تو بھی انجام تک پہونچنے کے لئے کافی زمانہ درکار ہے اور اگر ہم اس اقتصادی کشمکش کو بھی سامنے رکھیں جو اختتام جنگ کے بعد سارے عالم میں رونما ہونے والی ہے، تو پھر اس عذاب سے نجات پانے کی امید ان لوگوں کو نہ کرنا چاہئے جن کی عمر اسوقت ۵۰ سال سے متجاوز ہو چکی ہے

یہ جنگ دُنیا کے لئے اتنا بڑا صدمہ ہے کہ اس سے جانبر ہونے کے بعد بھی پوری طرح سنبھلنے کے لئے اسے کم از کم بیس سال اور چاہئے اور اس مدت میں دُنیا کی ایک تہائی آبادی کا ختم ہو جانا یقینی ہے

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان : حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان : اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں ۳۲ء سے ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ قدرت بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی اور معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ۔ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت : حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان، اسکی تخیل، اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت ایکروپیہ چار آنہ

مکتوبات نیاز : اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو نگار میں شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔ قیمت تین روپیہ

نقاب اُٹھ جانے کے بعد : نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول آٹھ آنے (۸ر)

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات : اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دُنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب ہر سہ جلد : ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

جذبات بھاشا : جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت بارہ آنے (۱۲ر) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم : اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:
۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ — ۲۔ مادیئن کا مذہب۔
۳۔ حرکت کے کرشمے — نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔
قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ

شاعر کا انجام : جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی
قیمت ایک روپیہ (عہ ر) علاوہ محصول

فراست الید : مولفۂ نیاز فتحپوری، جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت دو روپیہ (عہ ر) علاوہ محصول

مذاکرات نیاز : یعنے حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ دوسرا اڈیشن نہایت نفیس کاغذ پر شایع ہوا ہے۔
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ ر) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن : یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔
مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔
قیمت دو روپیہ (عہ ر)
علاوہ محصول

منیجر "نگار" لکھنؤ

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس گھنٹہ گھر لکھنؤ و شایع کردہ منیجر نگار لکھنؤ (ایس حسین)